33

17 ستمبر 2003ء - 19 رجب 1424ھ

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

- معاشرتی برائیاں اور اُن کا تدارک (منبر و محراب)
- پاکستان اور اسرائیل کے اندرونی تعلقات (خصوصی فیچر)
- ابلیس کی مجلس شوریٰ (اداریہ)

www.tanzeem.org

جلد 12 شمارہ 33

اسرائیل اور اسلامیانِ پاک و ہند

''فلسطین میں مسلمان اور اُن کے اہل و عیال شہید کئے جا رہے ہیں۔ اس ہولناک سفاکی کا مرکز یروشلم ہے جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ مسجد اقصیٰ کا تعلق حضرت خواجہ دو جہاں ﷺ کے معراج مبارک سے ہے اور معراج ایک دینی حقیقت ہے' جس کا تعلق مسلمانوں کے گہرے جذبات کے ساتھ ہے..... صدیاں گزر گئیں کہ ایک معبد تیار ہوا تھا' جسے ''ہیکل سلیمانی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ معبد مسلمانوں کے یروشلم فتح کرنے سے بہت پہلے برباد ہو چکا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے معراج کا ذکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا تو اُنہیں ہیکل سلیمانی یا مسجد اقصیٰ کے صحیح موقع و محل سے بھی مطلع کر دیا۔ فتح یروشلم کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہ نفس نفیس یروشلم تشریف لے گئے تو اُنہیں نے مسمار شدہ ''ہیکل سلیمانی'' کا محل وقوع دریافت فرمایا اور وہ جگہ ڈھونڈ لی۔ اُس وقت وہاں گھوڑوں کی لید جمع تھی' جسے انہوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ کو ایسا کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی جگہ صاف کرنی شروع کر دی اور یہ میدان پاک صاف ہو گیا۔ عین اس جگہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی' جس کا نام مسجد اقصیٰ ہے۔ یہود و نصاریٰ کی تاریخ میں تو یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ موجودہ مسجد اقصیٰ اُسی جگہ پر واقع ہے جہاں ہیکل سلیمانی واقع تھا۔ اس تشخیص کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اس کی زیارت کے لئے اس وقت آنا شروع کیا جبکہ یہ متشخص ہو چکی تھی..... ترک یہودیوں کے ساتھ غیر معمولی رواداری کا سلوک کرتے رہے۔ یہودیوں کی خواہش پر انہیں مخصوص اوقات میں دیوارِ برّاق کے ساتھ کھڑے ہو کر گریہ و بکا کرنے کی اجازت عطا کی۔ اس وجہ سے اِس دیوار کا نام اُن کی اصطلاح میں ''دیوارِ گریہ'' مشہور ہو گیا۔ شریعتِ اسلامیہ کی رُو سے مسجدِ اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے۔ جس قبضے اور تصرّف کا یہودی اب دعویٰ کرتے ہیں' قانونی اور تاریخی اعتبار سے اس کا حق انہیں ہرگز نہیں پہنچتا' سوائے اس کے کہ ترکوں نے انہیں گریہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔''

(شاعرِ مشرق' علامہ محمد اقبال۔ یومِ فلسطین پر خطبۂ صدارت' لاہور۔ 17 ستمبر 1929ء)

سورۃ البقرہ

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰی یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۝﴾ (آیت 246' 247)

''بھلا تم نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو نہیں دیکھا جس نے موسیٰ کے بعد اپنے پیغمبر سے کہا کہ آپ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیں تا کہ ہم خدا کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو عجب نہیں کہ لڑنے سے پہلو تہی کرو۔ وہ کہنے لگے کہ ہم راہِ خدا میں کیوں نہ لڑیں گے جبکہ ہم وطن سے (خارج) اور بال بچوں سے جدا کر دیئے گئے۔ لیکن جب ان کو جہاد کا حکم دیا گیا تو چند اشخاص کے سوا سب پھر گئے۔ اور خدا ظالموں سے خوب واقف ہے۔ اور پیغمبر نے ان سے (یہ بھی) کہا کہ خدا نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ وہ بولے کہ اسے ہم پر بادشاہی کا حق کیونکر ہو سکتا ہے بادشاہی کے مستحق تو ہم ہیں اور اس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں۔ پیغمبر نے کہا کہ خدا نے اس کو تم پر (فضیلت دی اور بادشاہی کے لئے) منتخب فرمایا ہے اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی (بڑا عطا کیا ہے) اور خدا (کو اختیار ہے) جسے چاہے بادشاہی بخشے۔ وہ بڑا کشائش والا اور دانا ہے۔''

حضرت موسیٰؑ کا انتقال تو اُس چالیس سالہ دور میں ہو گیا تھا جب بنی اسرائیل صحرائے تیہہ کے اندر بھٹک رہے تھے۔ اس کی تفصیل آگے سورۃ المائدہ میں آئے گی۔ حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے یوشعؑ بن نون کی سرکردگی میں فلسطین پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ مگر انہوں نے وہاں ایک حکومت نہیں بنائی بلکہ چھوٹی چھوٹی کئی حکومتیں قائم کر لیں۔ رفتہ رفتہ ان کی قوت کمزور ہو گئی اور آس پاس کی اقوام نے انہیں زیر کر لیا۔ یہ ان کے زوال کا دور تھا۔ پھر انہوں نے اپنے وقت کے نبی حضرت سیموئیلؑ سے کہا کہ ہمارے لئے اب کوئی سپہ سالار یا بادشاہ مقرر کر دیجئے تا کہ ہم اس کی کمان میں اللہ کی راہ میں دشمنوں کے خلاف قتال کر سکیں تو انہوں نے کہا کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ جب تم پر جنگ فرض کر دی جائے تو تم جنگ سے منہ موڑ جاؤ اور انکار کر دو۔ جیسا کہ تم نے موسیٰؑ کو کورا جواب دے دیا تھا کہ اے موسیٰؑ! تم جاؤ اور تمہارا رب دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں (یہ سورۃ المائدہ میں آئے گا) اس پر انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال نہ کریں حالانکہ ہمیں ہمارے گھروں سے نکال دیا گیا اور بیٹوں سے الگ کر دیا گیا۔ (ایسا ہوا ہو گا کہ اس وقت دشمنوں نے ان کے بیٹوں کو ان سے چھین لیا اور غلام بنا لیا ہو گا) لیکن پھر جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو انہوں نے پیٹھ موڑ لی۔ ہاں ان میں سے کچھ لوگ ثابت قدم رہے اور اکثریت ایڑیوں کے بل پیچھے مڑ گئی اور اللہ ان ظالموں سے خوب واقف ہے۔ اور ان کے نبی حضرت سیموئلؑ نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ طالوت کا نام قرآن میں تو طالوت آیا ہے مگر تورات میں SAUL ہے۔ طالوت ان کا صفاتی نام ہے کیونکہ وہ طویل القامت تھے اور اسی بنا پر انہیں طالوت کہا جاتا تھا۔ جب پیغمبر نے طالوت کے بارے میں بتایا کہ اللہ نے اسے تم پر بادشاہ بنایا ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ طالوت کو ہمارے اوپر بادشاہی ملے۔ ہمیں زیادہ حق ہے کہ ہمیں بادشاہت ملے اور ہم اس پر حکومت کریں۔ اس کے پاس تو زیادہ مال نہیں وہ تو غریب اور فقیر سا انسان ہے جبکہ ہم دولت مند اور صاحب مال ہیں۔ اس پر اللہ کے نبی نے انہیں کہا کہ اب جو چاہو کہو اللہ نے اس کو تمہارے اوپر چن لیا ہے' اب اللہ کا فیصلہ آ چکا اور یہ Divine decision تبدیل نہیں ہو سکتا' اللہ نے طالوت کو وافر علم اور جسمانی طاقت دے رکھی ہے جبکہ تمہارا معیار تو دولت ہے جو غلط ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بادشاہت دیتا ہے۔ وہ بڑی وسعت والا اور علم والا ہے یعنی وہ خوب جانتا ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے۔

فرمانِ نبویؐ

ہدیہ قبول کرنے کا حکم

چوہدری رحمت اللہ بٹر

((عن قبیصة بن ذؤیب رضی اللّٰہ عنہ ان عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ اعطی السعدی الف دینار فابٰی ان یقبلھا وقال لنا عنھا غنی' فقال لہ عمر رضی اللّٰہ عنہ انی قائل لک ما قال لی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم)) (اخرجہ ابن حبان)

''حضرت قبصیہ بن ذویبؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے السعدی کو ایک ہزار دینار کا عطیہ دیا۔ انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں تمہیں وہی کہتا ہوں جو مجھے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا (جو چیز بغیر طلب کئے ملے اسے لے لو' پھر خواہ خود استعمال کرو یا صدقہ کرو' کیونکہ یہ رزق ہوتا ہے' جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عطا ہوتا ہے)

اللہ تعالیٰ اس بندے کے لئے جو اس پر توکل کرتا ہے بہت سے ذرائع سے اس کی ضروریات کی فراہمی کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ان ھدایا کا قبول کرنا سوال کے زمرے میں نہیں آتا اور نہ ہی اس میں انسان کے لئے کوئی ندامت کا پہلو ہے۔

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابلیس کی مجلس شوریٰ

اس مرتبہ اُس نے اپنی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس 11/ ستمبر والے ''یہودی تجارتی مرکز'' کے ڈھائے جانے کی دوسری برسی کے موقع پر بھارت کے دارالحکومت نئی دہلی میں طلب کیا ہے۔ اب کے واجپائی اور ایڈوانی میزبان ہیں۔ مجلس شوریٰ کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے سری نگر جا کر کل جماعتی حریت کانفرنس میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ لداخ میں بڑے شیطان کے ساتھ مل کر مشترکہ فوجی مشقیں دورانِ اجلاس جاری رکھی جائیں تاکہ شال کو وارننگ تلے رکھا جا سکے۔ مہمانِ خصوصی اسرائیل کے وزیراعظم ایریل شیرون ہوں گے جو اپنے ہمراہ اسلحے کے بڑے نامی گرامی 150 یہودی تاجر بھی لائے ہیں جو بھارت کا پیٹ اسلحے سے بھرنے کے لئے سودا بازی کریں گے۔ بہت دُور سے خاتون کرسٹارو کا بھی آ رہی ہیں جو راز داری سے کانا پھوسی کریں گی اور مجلسِ شوریٰ کو فتنۂ فردا (اسلام) کی تازہ کارستانیوں سے آگاہ کریں گی اور ہر ممکن سیاسی، اخلاقی، فوجی، اقتصادی، سٹریٹجک امداد کا یقین دلائیں گی۔ محترمہ نے سرگوشی کی مزید مشاورت کے لئے پاکستان میں مقیم اپنی سفیر خاتون نینسی پاول کو بھی نئی دہلی بلا لیا ہے۔

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ سے باہر کھڑا ایک شاعر بھی راز داری کے ساتھ ہمارے کان میں کہہ رہا ہے:

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

لیکن ابلیس اور اُس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان آخرکار اپنے جال میں پھنستے نظر آ رہے ہیں کہ ہر ظلم کو انجام کار اپنی ہی خاک میں رُلنا ہوتا ہے۔ یہ لوگ تین صدیوں سے اُمتِ مسلمہ کے اندر اپنی معروف عیاریوں اور سازشوں سے جو نفاق کے بیج بو کر بدی کی فصل اٹھاتے رہے ہیں اب اُس کی کٹائی شروع ہو چکی ہے۔ پوری دنیا میں اب تلوار کا مقابلہ تلوار کی زیادہ شدید ضرب کے ساتھ، اور قلم کا مقابلہ قلم کی زیادہ کاٹ کے ساتھ دیا جانے لگا ہے۔ فلسطین، عراق، افغانستان، عربستان، چیچنیا اور کشمیر کے صحراؤں، میدانوں اور پہاڑوں میں اپنے سینوں پر گولے باندھ جو مرد و زن، بوڑھے اور بچے خودکش خون آلود حملوں کے ذریعے شجاعت و جرأت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی بھی سرکاری و جماعتی و تنظیمی سرپرستی کے بغیر خود بخود پوری دنیا کے چپے چپے میں، اندر ہی اندر پرنٹ میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کا جو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے، اُس نے ابلیسی طاقتوں کے ٹھکانوں پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگا کر انہیں بوکھلا دیا ہے۔ تحریر کے قدیم ہنر نے جدید ترین طریقوں سے ابلیسی عزائم کو تار تار اور اُن کی عیاری، فریب کاری اور سازشوں کو طشت از بام کر دیا ہے۔

تحقیق پر مبنی قلمی جہاد کی تازہ مثال ماہنامہ ''امپیکٹ'' (لندن) کا شمارۂ اگست ہے۔ یہ جریدہ 1971ء سے انتہائی نامساعد مالی حالات کے باوصف مسلمانانِ عالم کے فکری و ذہنی اور سیاسی و معاشی کوائف و حالات پر معلومات خیز مضامین فراہم کرنے میں گراں قدر انجام دے رہا ہے۔ شمارۂ اگست میں معروف دانشور اور صحافی احمد عرفان صاحب کے پانچ خصوصی مضامین شاملِ اشاعت ہیں، جن میں انہوں نے تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے ''پاکستان اور اسرائیل کے دیرینہ اور اندرونی تعلقات'' کا کھوج لگایا ہے۔ ہماری ''تنظیم اسلامی'' نے ''امپیکٹ'' کا یہ متعلقہ حصہ (انگریزی ہی میں) ایک پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر پاکستان بھر میں تقسیم کرایا ہے۔ اب اُن پانچوں مضامین کے مکمل اُردو تراجم ''ندائے خلافت'' کے موجودہ شمارے میں شامل کئے گئے ہیں، اور اسی بناء پر اس شمارے کو ''خصوصی'' کہلوانے کا حق پہنچتا ہے، جس کی خاطر سوائے ''تجزیہ'' کے معمول کے دوسرے مضامین کو قربان کیا گیا ہے۔ البتہ قدرت اللہ شہاب مرحوم نے اسرائیل کا جو دورہ کیا تھا، اور اپنے جو تاثرات قلم بند کئے تھے، اُس کا ایک حصہ موضوع کی نسبتِ خاص کی وجہ سے شامل کر لیا گیا ہے۔ ہم ادارہ ''امپیکٹ'' کی قلمی و اشاعتی کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم اُنہیں اور اُن جیسے تمام عالمی مسلم اداروں کو یقین دلاتے ہیں کہ اُن کے تحریری جہاد میں ہم اُن کے ہم قدم اور ہم قلم ہیں۔ ہم سب اپنی متحدہ اور اجتماعی کوششوں سے ابلیس پر، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اپنی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد کرے، لرزہ طاری کر دیں گے اور اُسے یہ کہنے پر مجبور کر دیں گے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اُس اُمت سے ہے — جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اِس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ — کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے — مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

(تحریر: مدیر اشاعتِ خصوصی)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

قیام خلافت کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت

جلد	11 تا 17 ستمبر 2003ء	شمارہ
12	۱۳ تا ۱۹ رجب المرجب ۱۴۲۴ھ	33

بانی: اقتدار احمد مرحوم
مدیر: حافظ عاکف سعید
مدیر (اشاعتِ خصوصی): سید قاسم محمود
نائب مدیر: فرقان دانش خان

مجلس ادارت
ڈاکٹر عبدالخالق۔ مرزا ایوب بیگ
سردار اعوان۔ محمد یونس جنجوعہ
نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعد طابع: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور
مقام اشاعت: 36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی:
67-گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور
فون: 6366638-6316638 فیکس: 6305110
E-Mail:markaz@tanzeem.org

قیمت فی شمارہ: 5 روپے
سالانہ زرِ تعاون
اندرونِ ملک......250 روپے
بیرونِ پاکستان
یورپ، ایشیا، افریقہ وغیرہ (1500 روپے)
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ (2200 روپے)

محترم ڈاکٹر رفیق احمد صاحب' سابق وائس چانسلر' پنجاب یونیورسٹی اور معتمد "نظریۂ پاکستان فائونڈیشن"

اپنے مکتوب میں فرماتے ہیں: آپ کا ارسال کردہ ندائے خلافت کا نظریۂ پاکستان نمبر موصول ہوا۔ آپ نے تحریک پاکستان' دوقومی نظریے اور نظریۂ پاکستان کی اصطلاحات کی جو الگ الگ تعبیریں بیان کی ہیں اور پھر ان کا باہمی تعلق واضح کیا ہے' وہ بالکل درست ہے۔ میں نے "نظریہ پاکستان" کے تعارفی پمفلٹ میں بھی کچھ اسی انداز سے گفتگو کی ہے' جو اس خط کے ہمراہ ارسال ہے۔ البتہ آپ نے زیادہ وضاحت اور فصاحت سے بعض لوگوں کے پھیلائے ہوئے وسوسوں کا تدارک کیا ہے جو لائق تحسین ہے۔ ویسے تو سارا رسالہ ہی نہایت اہم تشریحی مواد سے پُر ہے۔ ہر پاکستانی کو کم از کم ایک بار یہ رسالہ ضرور پڑھنا چاہئے۔ پچھلے ہزار سال کی فکری اور سیاسی تاریخ اس میں سمو دی گئی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ کا رسالہ مختلف درجات کے تعلیمی نصابات میں شامل ہو جائے۔

ایک دو امور پر توجہ دیجئے۔ صفحہ آٹھ پر بھارت کو آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک قرار دینا صحیح نہیں۔ انڈونیشیا کی آبادی 30 کروڑ سے تجاوز ہے۔ وہی سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کا مستند حوالہ دیجئے۔ پچھلی مردم شماری کے مطابق مسلمان 13 کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ آپ نے آخری صفحہ پر ماخذ دیئے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر مختلف مضامین میں دیئے ہوئے بیانات اور واقعات کے آخر میں پورے حوالے بمعہ صفحات درج ہوتے۔ اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ آپ کو اس اہم تصنیف پر جزائے خیر دے۔

محترم ڈاکٹر جمیل جالبی' سابق وائس چانسلر' کراچی یونیورسٹی اور سابق صدر نشین' مقتدرہ قومی زبان' بھی ہمارے خیال سے متفق ہیں. لکھتے ہیں:

گرامی نامی ملا اور ساتھ ہی "ندائے خلافت" کا نظریۂ پاکستان نمبر بھی۔ یہ آپ نے اچھا کیا کہ سب چیزیں ایک ساتھ مرتب و شائع کر دیں۔ یہ طلب کے لئے بھی مفید ہے۔ آپ نے نظریہ پاکستان' دوقومی نظریہ اور تحریک پاکستان کی جو وضاحت کی ہے اُس سے مجھے اتفاق ہے۔ تحریک پاکستان کی بنیاد دوقومی نظریہ پر قائم تھی اور ہے۔ نظریۂ پاکستان تو بہت بعد کی بات ہے۔

پروفیسر محمد احمد سبزواری' سابق مدیر ماہانہ "معاشیات" انجمن ترقی' اردو پاکستان اپنے خط میں رقم طراز ہیں:

مجھے ندائے خلافت کے پچھلے خصوصی شمارے دیکھنے کا تو اتفاق نہیں ہوا مگر آپ کی مہربانی سے تحریک پاکستان نمبر دیکھنے کا موقع ملا' میں نے بڑی تفصیل سے "نظریۂ پاکستان" کا مطالعہ کیا۔ گو اس سلسلے کی بہت سی باتوں کا سرسری علم تھا۔ مگر آپ کا یہ خصوصی نمبر دیکھ کر تو آنکھیں کھل گئیں۔ ہندوؤں کے مذہب کے آنکھوں دیکھا حال میں آپ نے البیرونی' خالدہ ادیب خانم اور بیورلے نکلسن کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کتاب مس میو کی "مدر انڈیا" میں بھی بہت سے دلچسپ حقائق کا انکشاف ہے۔ محمود غزنوی کے متعلق عام تاثر یہی تھا کہ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور فردوسی کے شاہ نامے والی فرض حکایت بہت مشہور تھی' اب پتہ چلا کہ وہ خود شاعر اور عالموں ادیبوں اور شاعروں کا بڑا قدردان تھا۔ اسی طرح شہاب الدین غوری کو ایک بیرونی حملہ آور سمجھا جاتا تھا' ان کو برصغیر میں اسلامی سلطنت کا بانی قرار دینا بالکل حال کا تصور ہے اور یقیناً ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اس عظیم سلطان کی قبر دریافت کر کے اس پر شایانِ شان مقبرہ بنوایا ہے۔

صفحہ 74 کے تیسرے کالم میں 1857ء کے واقعات میں مختلف شہروں کے نام درج ہیں' آپ کی اطلاع کے لئے گزارش ہے کہ ریاست بھوپال میں بھی بغاوت ہوئی تھی۔ شاہی خاندان کے دو افراد کو پھانسی دی گئی۔ ریاست کی انگریزی چھاؤنی میں تو "سپاہی بہادر" کے نام سے ایک نئی حکومت بھی قائم کر لی گئی تھی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "سپاہی بہادر" اسد محمد خان' بھوپال 1995ء) بعد میں ان 169 افراد کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ بہرحال آپ نے یہ نمبر نکال کر ایک علمی اور تاریخی خدمت انجام دی ہے۔ اس پر دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔

محترم عبدالرشید عراقی' گوجرانوالہ کے گرامی نامے کا اقتباس:

"نظریہ پاکستان نمبر" صفحہ اول تا آخر زیر مطالعہ آیا ہے۔ یہ نمبر بھی آپ کے سابقہ نمبروں (فلسطین نمبر' عراق نمبر' اقبال نمبر) کی طرح ہر لحاظ سے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت عمدہ' اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اس نمبر کی فہرست مضامین ہی سے اس کی خصوصیات اجاگر ہو گئیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت محمد بن قاسم تا اختتام مغل فرمانروا' آپ نے اختصار کے ساتھ' ہر فرمانروا کے عہد حکومت کی تاریخ اور اُن کے کردار اور اُن کے کارناموں پر جو تبصرہ کیا ہے' اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس کے دوسرے مضامین بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

باب 20 علمائے دیوبند کی تاریخی نشست میں آپ نے علمائے دیوبند کی تحریک پاکستان سے متعلق خط و کتابت شائع کی ہے۔ اگر اس کے ساتھ دوسرے مسالک (اہلحدیث' بریلوی' شیعہ) کے علمائے کرام کی سعی و کوشش اور ان کی خدمات پر بھی مختصر اروشنی ڈال دی جاتی' تو میرے خیال میں مضمون زیادہ اہمیت کا حامل ہو جاتا۔

میرا مشورہ ہے۔ اگر اس نمبر کی اشاعت ثانی کی نوبت آئے یا اسے کتابی صورت میں شائع کرنا ہو تو باب 20 میں اضافہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ تحریک پاکستان کے سلسلہ میں جن سیاسی' ادبی اور علمی شخصیات نے اخبارات و رسائل میں مضامین لکھے اور ہندوؤں کے تعصب اور ان کی مسلم دشمنی کی نشاندہی کی' ان کی بھی ایک فہرست شائع کی جائے۔

محترمہ رعنا خان' شکاگو (امریکا) کا یہ خط اُردو میں ای میل سے آج ہی موصول ہوا ہے:

ماشاء اللہ ندائے خلافت نے نمبر در نمبر نکالنے کی ایک نئی روایت ڈال کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ندائے خلافت ایک ہفت روزہ ہی نہیں بلکہ نظریاتی مشن بھی ہے۔ ملک و قوم کی سب سے بڑی خدمت دورِ حاضر میں یہی ہے کہ قوم اور رہبرانِ قوم کو اصلاحِ احوال کی طرف متوجہ کیا جائے۔ یوں تو پورا ہی نظریۂ پاکستان نمبر انتہائی معلوماتی ہے لیکن اداریہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اداریہ اتنے دلچسپ پیرائے میں لکھا گیا ہے کہ طبیعت بے ساختہ پورا پرچہ پڑھنے کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ آنے والے خاص نمبروں کے لیئے بھی برادر قاسم محمود ایسے ہی منفرد اسٹائل کے اداریے تحریر فرمائیں گے۔

محمد وفا گردیزی کا ای میل انگریزی میں ہے. ترجمہ یہ ہے:

"آپ کو اور سید قاسم محمود کو "نظریۂ پاکستان" جیسا شاندار اور انتہائی اہمیت کا حامل خصوصی شمارہ نکالنے پر دلی مبارک باد۔ اسے کتابی صورت میں بھی شائع ہونا چاہئے۔

اس ہفتے کا آخری خط

براہِ کرم یہ شمارہ مکمل مطالعہ کرنے کے بعد اپنی قیمتی رائے سے ہمیں آگاہ کرنا نہ بھولئے (مدیر)

چند معاشرتی برائیاں اور اُن کا تدارک

سورہ بنی اسرائیل کی آیات 35 تا 39 کی روشنی میں

مسجد دارالاسلام باغ جناح لاہور میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید کے 5 ستمبر 2003ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں اسلامی معاشرے کے خدوخال بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مطابق ان دونوں رکوعوں میں تورات کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے رکوع کا نصف اول ہم پڑھ چکے ہیں' آج ہم نصف آخر کا مطالعہ کریں گے۔ فرمایا:

''اور پورا بھرو پیمانے کو جب ناپو' اور تولو درست ترازو سے۔ یہی طریقہ اچھا ہے اور سب سے بہتر ہے انجام کار کے اعتبار سے۔'' (آیت:35)

اجتماعی سطح پر اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ ملاوٹ اور ناپ تول میں کمی کا سدباب ہو سکے۔ جو لوگ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں وہ درحقیقت آخرت پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ بظاہر چھوٹا سا عمل ہے لیکن اس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کا اللہ پر ایمان ہے نہ آخرت پر' کہ وہ اس بات کا یقین نہیں رکھتا کہ ایک دن اُسے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

حال ہی میں ہماری وفاقی کابینہ نے ملاوٹ کے خلاف جو بل پاس کیا ہے وہ لائق تحسین ہے' کیونکہ کھانے پینے کی اشیاء اور ادویات میں ملاوٹ واقعتاً بڑا گھناؤنا جرم ہے۔ لیکن ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کرپشن' بددیانتی اور جھوٹ اس طرح ہمارے معاشرے کی رگوں میں سرایت کر گیا ہے کہ ایسے قانون کا مطلب یہ ہے کہ رشوت کا ایک اور باب کھل گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کرپشن اور بددیانتی کے اسباب پر قابو پایا جائے' یعنی معاشرے میں ایمان و تقویٰ کی سطح کو بلند کرنا لازم ہے' ورنہ ظاہری اصلاح کار کا عمل بے کار ہے۔

جس معاشرے میں ملاوٹ اور ناپ تول میں کمی کی خرابی پیدا ہو جاتی ہے' وہاں بداعتمادی' بے سکونی اور بدگمانی عام ہو جاتی ہے۔ لہٰذا معاشرے میں اگر باہم اعتماد کی فضا اور امن و سکون چاہئے تو اس کی روک تھام بہت ضروری ہے۔ افراد کے لئے اس میں ہدایت کا پہلو یہ ہے کہ جو اس برائی سے بچے گا اس کی آخرت تو بہتر ہوگی' دنیا میں بھی اسی کو فائدہ ہوگا' کیونکہ جو دیانت داری کو اپناتا ہے بالآخر وہی ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ مغرب نے اسی بناء پر اس اصول کو اپنایا ہے کہ "Honesty is the best policy"

آگے فرمایا:

''اور نہ پیچھے لگو ایسی بات کے جس کا تمہیں پختہ علم نہ ہو۔ بے شک کان' آنکھ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت (یعنی دل و دماغ) ان سب کے بارے میں تم سے باز پرس ہوگی''۔ (آیت:36)

یہ بھی بڑی اہم ہدایت ہے اور اس کا اطلاق زندگی کے بہت سے گوشوں اور شعبوں پر ہوتا ہے۔ اخلاقیات کی سطح پر اس قرآنی ہدایت کا تقاضا یہ ہوگا کہ ہر نوع کی تہمت' الزام تراشی اور سوءِ ظن سے اجتناب کیا جائے۔ جب تک کسی کے بارے میں ثابت نہ ہو جائے کہ وہ جھوٹا' فریبی یا بددیانت ہے' اس کے بارے میں سوئے ظن رکھنے کی اسلام میں گنجائش نہیں ہے۔ اسی طریقے سے عدالتی نظام میں اس قرآنی ہدایت کا تقاضا یہ ہوگا کہ محض شک کی بناء پر کسی کو نہ تو گرفتار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی سزا دی جا سکتی ہے جب تک کہ جرم پورے طور پر ثابت نہ ہو جائے۔ اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ خواہ سو مجرم چھوٹ جائیں لیکن کسی بے گناہ کو سزا نہ ہو۔

اسی طرح توہمات بھی چونکہ کسی پختہ علم کی بنیاد پر نہیں ہوتے لہٰذا ان کی بھی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ خلاف شرع معاشرتی رسومات کی بھی یہ آیت جڑ کاٹتی ہے کہ محض یہ بات کہ یہ رسومات ہمارے باپ دادا کے دور سے چلی آ رہی ہیں کوئی وزن نہیں رکھتی جب تک اس کے ثبوت میں کوئی ٹھوس علمی دلیل' یعنی قرآن و سنت سے دلیل پیش نہ کی جائے۔ اسی طرح اس آیت کی رو سے تمام ظنی علوم یعنی پامسٹری' علم نجوم' علم جفر وغیرہ میں دلچسپی دینی نقطہ نگاہ سے ناپسندیدہ ہے۔ اسلامی تعلیم تو یہ ہے' بقول اقبال ؎

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اور ؎

خدا آن ملتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت

یعنی مسلمان ان چکروں میں وقت ضائع نہیں کرتا کہ ستاروں کی گردش کے اثرات کیا ہیں' اور کل کیا ہوگا وغیرہ' بلکہ وہ اللہ کی جانب سے عائد کردہ فرائض کو ادا کرتے اور اللہ کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے اپنے قوتِ عمل سے اپنی تقدیر خود معین کرتا ہے۔

اگلی ہدایت ہے:

''اور زمین میں اکڑ کر مت چلو' حقیقت یہ ہے کہ تم نہ تو پھاڑ سکتے ہو زمین کو اور نہ پہنچ سکتے ہو پہاڑوں کی بلندی کو۔'' (آیت:37)

جو شخص اکڑ کر چلتا ہے' ایڑیاں مار کر اور سر اٹھا کر چلتا ہے' وہ اپنے اس بھونڈے طرزِ عمل سے نہ زمین پھاڑ سکتا ہے نہ پہاڑ جتنا بلند ہو سکتا ہے۔ متکبر شخص دراصل مریضانہ ذہن رکھتا ہے۔ اس آیت میں رہنمائی ہے کہ حقیقت کو پہچانو۔ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی عطا ہے لہٰذا اللہ کا شکر بجالاؤ۔ جو شخص اس کے برعکس تکبر اور اکڑ کا مظاہرہ کرتا ہے وہ انتہائی نادان ہے اور لائق مذمت ہے۔ فطرت انسانی جانتی ہے کہ یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے' کوئی شخص ایسے متکبر شخص کو پسند نہیں کرتا۔ آگے فرمایا:

''یہ سب ایسے امور ہیں کہ ان کا برا پہلو تمہارے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔'' (آیت:38)

ایک بندۂ مومن کے نزدیک بس پیمانہ تو یہ ہونا چاہئے کہ کوئی چیز اللہ کو ناپسند ہے تو وہ اسے اختیار نہ کرے۔ مثلاً کبر اور غرور اللہ کو انتہائی ناپسند ہے' اس سے بچا جائے۔ دراصل جن چیزوں سے اللہ نے روکا ہے ان میں برائی اور شر کا پہلو موجود ہے۔

''یہ وہ باتیں ہیں جو وحی کی ہیں تمہاری طرف تمہارے رب نے حکمت میں سے۔ اور نہ ٹھہراؤ تم اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود ورنہ ڈال دیئے جاؤ گے جہنم میں' ملامت زدہ اور ہر بھلائی سے محروم ہو کر۔'' (آیت:39)

وحی حکمت و دانائی کی وہ سطح ہے کہ انسانی عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ایک آئیڈیل اسلامی انسانی معاشرے کے خدوخال کیا ہوں اس بارے میں اعلیٰ ترین رہنمائی

⇦

اس کائنات کا ربّ ہی دے سکتا ہے جو الحکیم ہے۔ قرآن اسی کی طرف سے بھیجی گئی کتابِ حکمت ہے' اس میں جو اصول دیئے گئے وہ حکمت سے خالی نہیں۔ اگر انسان پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے لئے اجتماعی نظام خود تشکیل دے تو وہ کبھی عادلانہ منصفانہ نظام تشکیل نہیں دے سکتا جیسا کہ مغرب میں ہوا۔ مغربی نظامِ حیات میں بعض پہلوؤں سے جہاں کچھ خوبیاں ہیں وہاں گراوٹ اور اخلاقی پستی کے حوالے سے وہ انتہا پر پہنچے ہوئے ہیں۔ پس اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ حقیقی معنوں میں عادلانہ ومنصفانہ نظام صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔

جس طرح اس بحث کا آغاز شرک کی مذمت اور توحید کے اثبات سے ہوا تھا اسی طرح اس کا اختتام بھی شرک کی مذمت پر ہو رہا ہے۔ دونوں رکوعوں کے اوّل وآخر توحید کے تذکرے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایک اسلامی معاشرے کا اصل الاصول توحید ہے' جس کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ غیر اللہ کی حکمرانی کو ختم کر کے اللہ کی حاکمیت کو قائم کیا جائے۔ دستوری سطح پر قرآن وسنت کو بالادست حیثیت دیئے بغیر کوئی ریاست اسلامی ریاست نہیں کہلا سکتی۔

اسلام کا پورا نظام اجتماعی یعنی معاشی' معاشرتی اور سیاسی نظام دراصل اسی توحید کی فروعات ہیں۔ یہاں تک اسلامی معاشرے کی تشکیل سے متعلق ہدایات ختم ہوئیں۔ رکوع کی آخری آیت میں نزولِ قرآن کے وقت عرب معاشرے میں موجود ایک مشرکانہ عقیدے کی بیخ کنی کی گئی ہے' گویا اس آیت میں بھی توحید ہی کو مبرہن کیا گیا ہے۔ فرمایا:

> "یا نوازا ہے تم کو تمہارے رب نے بیٹوں سے اور بنالی ہیں فرشتوں میں سے (اپنے لئے) بیٹیاں۔ واقعہ یہ ہے کہ تم کہہ رہے ہو بہت بڑی (گستاخانہ) بات۔" (آیت: 40)

یہ شرک کی سب سے گھناؤنی صورت ہے کہ کسی کو اللہ کی اولاد ٹھہرایا جائے۔ یہ بے عقلی کی انتہا اور بڑی گستاخی کی بات ہے۔ اس حوالے سے مشرکین عرب پر طنز کیا گیا ہے کہ تم خود تو اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہو اور اللہ کے لئے تم نے اگر اولاد ٹھہرائی ہے تو بیٹیاں۔ گویا شرک نے تمہاری بالکل ہی مت ماردی ہے اور تم حماقت وضلالت کی آخری حدوں کو چھو رہے ہو۔ فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں اور وہ اللہ کی اطاعت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یہاں متنبہ کیا جارہا ہے کہ تم اس جسارت سے باز آجاؤ' ورنہ اللہ کے غضب کے مستحق ٹھہرو گے' کیونکہ اللہ شرک کو کسی صورت معاف نہیں کرے گا۔ یہاں چوتھا رکوع ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی معاشرتی احکام کے حوالے سے حکیمانہ بحث اپنے اختتام کو پہنچی۔

مکتوب شکاگو!

اسٹوپڈ امریکا!

تحریر: رعنا خان

ٹائن الیون میموریل آئٹمز' ٹائن الیون اینی ور سری گفٹس' ٹی شرٹس' کیپ' سکے' ٹوئن ٹاورز کے ماڈلز' کی چین' اسٹیمپ غرض کہ طرح طرح کی چیزیں جوں جوں سانحہ گیارہ ستمبر کی دوسری سالگرہ نزدیک آتی جارہی ہے ٹائن الیون کے نام پر مہنگے داموں فروخت کی جارہی ہیں۔ آج کی امریکی معاشرت taboos سے بھری پڑی ہے یعنی ایسی چیزیں جن کے خلاف بات کرنا ماڈرن سوسائٹی کے نزدیک دقیانوسیت' تعصب اور جاہلیت ہے۔ ان ہی میں ایک امریکی عوام اور حکومت کی مضبوط یہودی لابی کے سامنے بیچارگی اور بے وقوفی بھی ہے۔ امریکی تاریخ میں فی الوقت جتنے اسٹوپڈ لوگ مسندِ اقتدار پر قابض ہیں اس کی مثال گزشتہ امریکی تاریخ میں ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔ یہ اسٹوپڈ امریکی حکمران جہاں اس بات پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے کہ امریکہ کی اجازت کے بغیر اسرائیل کو یہ ہمت نہیں ہوسکتی کہ دنیا کی مخالفت کا سامنا کر سکے وہیں اس حقیقت سے قطعاً غافل دکھائی دیتے ہیں کہ اسرائیل ہی ان کا اصل دشمن ہے اور ان کو حقیقی خطرہ بھی اسرائیل ہی کی طرف سے ہے۔ سانحہ گیارہ ستمبر کو عالم اسلام کے پلڑے میں ڈالنے والا امریکہ نجانے کیوں یہ بھول گیا ہے کہ اسرائیل نے 1954ء میں امریکہ کے خلاف دہشت گردی کا ایک منصوبہ ترتیب دیا تھا جسے "آپریشن سوزانہ" کا نام دیا گیا۔ اس آپریشن کا مقصد مصر میں موجود امریکیوں کو ہلاک کرنا اور امریکی تنصیبات کو تباہ کرنا تھا تاکہ اس کی ذمے داری مصر پر ڈال کر امریکہ کو مصر کے خلاف کارروائی پر مجبور کیا جائے اور اسرائیل اس کا فائدہ اٹھا سکے۔ اس موقع پر اسرائیل قاہرہ اور اسکندریہ میں کسی حد تک تباہی پھیلانے میں کامیاب بھی ہوا لیکن ایک امریکی مووی تھیٹر کو تباہ کرنے کے لئے لایا جانے والا بم ایک اسرائیلی ایجنٹ کے ہاتھوں پھٹنے سے اسرائیل کا مکروہ چہرہ اور مذموم منصوبہ رنگے ہاتھوں بے نقاب ہوگیا تھا۔ اسی طرح 1967ء کی چھ روزہ جنگ میں بھی اسرائیل نے امریکہ پر ایک اور دہشت گردانہ حملہ کیا جس میں اسرائیل کے خفیہ طیاروں اور تارپیڈو بوٹس نے امریکی بحریہ کے مایہ ناز جہاز یو۔ ایس۔ ایس لبرٹی پر تقریباً دو گھنٹے تک گولے برسائے جسکے نتیجے میں 34 افراد لقمہ اجل بنے اور 176 افراد زخمی ہوئے۔ جب اسرائیل کو مکمل کامیابی ہوتی نظر نہ آئی تو اس نے اسے شناخت کی غلطی قرار دیتے ہوئے بہانہ گھڑا کہ وہ اسے مصر کا جہاز سمجھے تھے جبکہ اس پر امریکی جھنڈا اور دیگر امریکی نشانات موجود تھے۔ امریکہ نے آنکھوں دیکھی مکھی کچھ یوں نگلی کہ اس واضح حملے کے باوجود اسرائیلی معذرت نہ صرف فوراً قبول کرلی بلکہ یہودی لابی کی مضبوطی کے باعث امریکی کانگریس نے اس واقعے کی رسمی تحقیقات تک کرانے سے گریز کیا اور یہودیوں نے اپنے میڈیا سے بھرپور کام لیتے ہوئے ان واقعات کو امریکیوں کے ذہن سے محو کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دوسری طرف آج ورلڈ ٹریڈ سینٹر کو گراؤنڈ زیرو بنے دو برس ہوگئے ہیں لیکن شاذ ہی کوئی ایسا دن گزرا ہو جب میڈیا نے اس واقعے پر "روشنی" نہ ڈالی ہو۔ امریکی میڈیا پر مسلط یہودی قوم مسلمانوں کے خلاف محاذ کو زندہ جاوید بنائے رکھنے کے لیئے امریکی قوم کو یہ سانحہ گھول کر پلانے میں مصروف ہے۔ گیارہ ستمبر کے حادثے کے بعد چند گھنٹوں کے اندر اندر ہر طرف امریکی پرچم لہراتا نظر آرہا تھا۔ گھروں میں' کاروں پر' لان میں' کپڑوں پر' عمارتوں' پلوں کے علاوہ دیواروں پر پرچم باقاعدہ پینٹ کر ڈالا گیا تھا۔ بلین ڈالرز امریکی عوام نے پرچم خریدنے پر پھونک ڈالے۔ ایسے لوگوں کو جنہوں نے دس سے زیادہ پرچم خریدے ٹی۔وی پر یہودی میڈیا کے کرتا دھرتاؤں نے بار بار اس قدر دکھایا کہ پوری قوم پرچم کریز میں مبتلا ہوکر بازار چل پڑی اور یہودیوں کو خوب بزنس ملا۔ اگر امریکی قوم جان جائے کہ یہ سب مارکیٹنگ ہے جو امریکہ کے اصل دشمن یہود کی جیب بھاری کررہی ہے تو امریکی قوم یقیناً اپنے پرچم کو اپنی حکومت کی غیر منصفانہ پالیسیوں اور اس سسٹم کے خلاف لہرائیں جس میں وہ محض ایک روبوٹ بن کر رہ گئے ہیں کہ جو یہودی میڈیا ڈرائیو ان کلچر کہہ دیتا ہے یہ وہی کرنے لگتے ہیں۔ نیوز مانگرز ہوں یا انٹرویو دینے والے' پرچم اور سووینئرز بیچنے والے ہوں یا گیارہ ستمبر کے متعلق ویب سائٹس بنانے والے سب کے سب سانحہ ٹائن الیون کو کیش کرنے میں مصروف ہیں۔ ٹریجڈی سے پرافٹ بنانے کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ CNN.Com نے اپنی 9/11 کی براڈ کاسٹ کی کاپیز انتہائی مہنگے داموں فروخت کیں۔ اور یہ ہے اس قوم کا جذبۂ حب الوطنی کہ اس یہودی چینل سے کوئی باز پرس اس سلسلے میں نہیں کی گئی۔ بازاروں میں اسوقت کئی کئی ٹن مرچنڈائز ٹائن الیون کی یادگار کی شکل میں بھری پڑی ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ یہ بھی کرسمس کی طرح کا ایک دن بن کر رہ جائے اور لوگ اس کی آمد پر اپنے گھروں کو اس دن کی یادگاروں اور پکچروں سے سجا کر' ہاتھوں میں شمعیں' گلدستے اور پرچم تھام کر GOD BLESS AMERICA گائیں

پاکستان کا قومی عہد و پیمان

ایک یادگار تاریخی دستاویز

❁❁*❁*❁*❁*❁*

''کیمپ ڈیوڈ'' جاتے ہوئے' واشنگٹن میں اور پھر پاکستان واپس آتے ہوئے جنرل پرویز مشرف صیہونیت کا دم بھرنے کا اعادہ کرتے رہے' وہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کو جذبات کی بجائے سنجیدگی سے لینا چاہئے۔ ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی رَو میں بہہ کر وہ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ یہ کہہ کر سب کا منہ بند کر دیں گے کہ ''پوپ سے بڑھ کر کیتھولک'' اور ''فلسطینیوں سے بڑھ کر فلسطین'' بننے کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ موصوف کو کیتھولک بننے کی ضرورت ہے نہ اپنا قبلہ درست کرنے کی۔ اگر ضرورت ہے تو صرف اپنا قبلہ درست کرنے کی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اُن کی والدہ صاحبہ کا کہنا ہے' وہ ایسے کوئی ہونہار سپوت بھی نہیں تھے۔

فلسطین کے لئے پاکستان کی حمایت اصولی اور نظریاتی ہے' اور مسلمانانِ ہند و پاک کی یہ حمایت قیامِ پاکستان سے بھی چلی آ رہی ہے۔ پورے عالم اسلام کے لئے پاکستان کی حمایت خود پاکستان کے بنیادی نظریے' تحریک اور مقاصد پر مبنی ہے۔

اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کا تاریخی اجلاس 18 تا 22/ فروری 1974ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اُس وقت پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے۔ اُس وقت انہوں نے بطور میزبان ملک جو تقریر کی تھی' اُس کے ایک طویل اقتباس کا اُردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ جذباتی نہیں' واقعاتی اور حقیقی ہے۔ یہ تاریخ کے بنیادی اور مستحکم اصولوں اور بین الاقوامی قانون پر مبنی تھا۔ پاکستان نے جو مؤقف شروع دن سے اختیار کر رکھا ہے' اُس سے دھوکا کیا جا سکتا ہے' اس میں ملاوٹ نہیں کی جا سکتی۔

❁ ''34 سال پہلے لاہور میں وہ عظیم الشان اور تاریخ ساز قرارداد منظور ہوئی تھی' جس کی اساس پر قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے شاندار تحریکِ آزادی کا آغاز کیا تھا۔ اور یہ بھی کوئی کم اہمیت کا واقعہ نہیں ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جس سالانہ اجلاس میں ''قراردادِ پاکستان'' منظور ہوئی تھی' اُسی اجلاس میں ''قراردادِ فلسطین'' بھی اتفاقِ رائے سے منظور ہوئی تھی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا:

> ''پورے غور و خوض کے بعد' واضح اور غیر مبہم الفاظ میں قرار پایا کہ تقسیمِ فلسطین کی تقسیم کے عبوری نوعیت کے ایسے بندوبست نہ کئے جائیں جو عالم اسلام سے کئے گئے وعدوں کے لفظاً و معناً خلاف ہوں۔''

قرارداد میں مزید تنبیہ کی گئی کہ ''عربوں کو مطیع و محکوم بنانے کے لئے اور انہیں ہراساں کرنے کے لئے ارضِ مقدس میں طاقت کا استعمال نہ کیا جائے' ورنہ یہ صورتِ حال خطرناک ثابت ہوگی۔''

عالم الاسلام کے جائز مقاصد کے لئے پاکستان کی حمایت فی الحقیقت اس کے اپنے قومی عہد نامے کا حصہ ہے۔ ہمارے قومی جذبے اور مسلمانانِ عالم کی آزادی کے درمیان جو گہرا رشتہ ہے' اُس میں کبھی کمزوری یا رکاوٹ نہیں آئی۔ جب فلسطین کی تقسیم کا فیصلہ ہوا تھا تو اس فیصلے کے خلاف لاہور میں زبردست احتجاجی مظاہرہ ہوا تھا' جس میں عظیم اسلامی شاعر علامہ اقبال بھی شریک تھے۔ انہوں نے قضیۂ فلسطین پر اپنی تقریر میں کہا تھا: ''فلسطین کا مسئلہ اکیلے فلسطین کا مسئلہ نہیں ہے' بلکہ پوری دنیائے اسلام کا مسئلہ ہے۔ فلسطین کی تقسیم کے نتائج کے اثرات تمام اسلامی ملکوں پر پڑیں گے۔''

بعد ازاں قیامِ پاکستان کے صرف دو ماہ بعد فلسطین کی تقسیم سے پیدا ہونے والے نتائج سے خبردار کر دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا: ''ایسا زبردست فساد اور تنازعہ رونما ہوگا کہ جس کی نظیر نہ مل سکے گی' بلکہ عالمِ اسلام بھی ایسے فیصلے کے خلاف' جس کی تاریخی' سیاسی یا اخلاقی' کسی بھی اعتبار سے تائید نہیں کی جا سکتی' بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہوگا۔''

اس کے چند روز بعد پاکستان نے اقوامِ متحدہ میں بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ارضِ مقدس کو مصیبتوں اور کانٹوں میں اُلجھایا جا رہا ہے۔ آج کے حالات پر بھی یہ الفاظ صادق آتے ہیں۔

پچاس سال پہلے کوئی مسئلہ فلسطین نہ تھا۔ صرف ایک ملک ہوتا تھا جس کا نام فلسطین تھا۔ ہوا کیا ہے؟ ہوا یہ ہے کہ مغربی استعمار نے اپنے شعارِ حق تلفی کے تحت ایک مغربی قوم کو اتنا طاقتور بنا دیا کہ اُس نے دوسری مغربی قوم کے ایک حصے (یہود) سے وعدہ کر لیا کہ وہ تیسرے ملک (فلسطین) پر اُس کو قبضہ دلوائے گی۔ میں اس نکتے پر زور دے کر کہوں گا کہ یہی وہ بنیادی بے انصافی ہے' جس کے باعث صدیوں سے مقیم و ساکن قوم کو اُن کے وطن سے اُجاڑا گیا اور اُن کی جگہ باہر سے لائے گئے اجنبیوں کو آباد کیا گیا۔ یہی وہ بنیادی بے انصافی ہے جو پوری دنیائے اسلام کے غیظ و غضب کا سبب بنی ہوئی ہے۔

اس مرض میں استعمار کی پیدا کردہ سرطانی گلٹی بھی ہے' نو آبادکاروں کی بستیاں بھی ہیں اور باہر سے آنے والی اقلیت کی اکثریت پر حکمرانی اور ظلم و تشدد بھی ہے۔ اس تنازعے کا بنیادی سبب مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان یا عرب اور یہودی کے درمیان دیرینہ عداوت نہیں ہے۔ ہم بطور مسلمان کسی بھی انسانی جماعت یا برادری سے کوئی مخاصمت نہیں رکھتے۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہودیوں کو الگ نہیں رکھتے۔ یہود سے بطور یہود ہمارے دل میں کینہ اور تعصب نہیں ہے' ہاں توسیع پسندانہ عزائم رکھنے والے صیہونی' جو جنگ جُوئی کے نشہ اور اپنے اسلحے کے غرور میں بدمست بنے ہوئے ہیں' اُن سے ہم ہمدردی نہیں رکھ سکتے۔ بلاشبہ گزشتہ کئی صدیوں کے دوران میں یہود کے جو منظم اجتماعی قتل ہوئے اور جرمن نازیت کے تحت

جو عذاب انہوں نے سہے' وہ انسانی تاریخ کے سیاہ ترین اوراق ہیں' لیکن اس کا کفارہ مغربی دنیا کو ادا کرنا چاہئے تھا' نہ کہ پورا نزلہ بے چارے فلسطینیوں پر گرا دیا گیا۔

پچاس سال سے فلسطینیوں کا المیہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو پریشان اور متفکر کئے ہوئے ہے۔ 1947ء میں فلسطین کی تقسیم سے جو اضطراب پیدا ہوا' پھر 1967ء میں فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کے قبضے سے جو مزید رنج پہنچا' وہ پورے عالمِ اسلام کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا ہے' اس لئے کہ یہ سرزمین مسلمانوں کے لئے روحانی طور پر مقدس و متبرک ہے۔ فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں اُس وقت پیش کیا گیا تھا۔ جب یہ ادارہ بین الاقوامی برادری کا نمائندہ نہیں تھا۔ تقسیمِ فلسطین کا جو منصوبہ اُس وقت کی ''اقوام متحدہ'' نے منظور کیا تھا' آج کی ''اقوام متحدہ'' میں پیش کیا جائے تو بھاری اکثریت سے نامنظور ہو جائے گا۔ اس بھاری اکثریت میں تیسری دنیا کی اقوام بھی شامل ہیں' جو لوگوں کے حقِ خود ارادیت پر یقین و پیمان رکھتی ہیں۔ مسلم ممالک نے اُس وقت بھی مغربی دنیا کو اُس کے طویل المیعاد مفادات یاد دلائے تھے اور بتایا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کی تنگنائے میں یہودیوں کو باہر سے لاکر زور زبردستی سے آباد کرنے کی حماقت نہ کریں۔ مگر ان یاد دہانیوں پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔ ان التجاؤں اور درخواستوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا گیا۔

1967ء کے بعد تو اسرائیل کچھ اور بھی زیادہ متکبر اور گستاخ ہو گیا۔ اُس نے اقوام متحدہ کے فیصلوں کا تمسخر اڑایا۔ اسرائیل کے حمایتی بھی زیادہ بے نیاز ہوتے گئے۔ اور 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی' اُس کی نزاکت و شدت کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ناحق بلکہ احمقانہ سہی خاموشی جم کر بیٹھ گئی اور حکمت و دانائی کی قوتیں مفلوج ہو کر گئیں۔

اکتوبر 1973ء کی جنگ کے نتیجے میں کچھ ایسی روئیں چلی ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے مسئلے کا منصفانہ حل نکل آئے گا۔ عالمی برادری کی اکثریت نے عرب کاز کی پُرزور حمایت کی ہے۔ افریقہ کی اقوام نے اصول کو مصالحت پر ترجیح دیتے ہوئے عربوں کے ساتھ اتفاقِ رائے کا اظہار کیا ہے۔ مغربی اقوام بھی' صورتِ حال کے حسن و قبیح کی فہم کے ساتھ نہ سہی' اقتصادی تقاضوں کے جبر کے تحت مشرقِ وسطیٰ کے حتمی حل کی ضرورت محسوس کرنے لگی ہیں۔ مصالحت کی جو کارروائیاں اب شروع ہوئی ہیں' اُن کے خلاف آواز اٹھانا مناسب نہیں۔

یہ کارروائیاں اچھا شگون ہیں۔ لیکن یہ شگون بدشگونی میں بھی تبدیل ہو سکتے ہیں' اگر اسرائیل کے حمایتیوں نے مسئلے کے بنیادی سبب سے لاتعلقی برتی اور مسئلے کے محض عارضی اور جزوی حل کو اطمینان بخش خیال کیا۔ جہاں تک عرب ممالک کا تعلق ہے' انہوں نے صاف صاف ظاہر و ثابت کر دیا ہے کہ اُن کا نقطۂ نظر اور طریقِ عمل دینی و مذہبی نہیں ہے' بلکہ علیحدگی پسندی سے شروع ہونے والے قضیے کی پُرامن تدابیر پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ علیحدگی پسندی کو امن نہیں کہا جا سکتا۔ علیحدگی پسندی کو اگر حتمی حل کا متبادل سمجھ لیا گیا' تو امن کی خواہش ایک سراب بن کر رہ جائے گی۔

ہمیں یہ توقع رکھنے کا حق پہنچتا ہے کہ جنیوا میں جس معاہدۂ امن پر بات چیت ہو رہی ہے' اُس میں مشرقِ وسطیٰ کے تنازعے سے متعلق تمام بنیادی اُمور کا لحاظ رکھا جائے گا۔ یعنی 1967ء سے تمام مقبوضہ عرب علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کی واپسی' عربوں کے اقتدارِ اعلیٰ کے ماتحت بیت المقدس (یروشلم) کی بحالی اور فلسطینیوں کے حقوق کی بحالی' حتمی حل کی بنیادی عوامل ہیں۔ یہ تمام عوامل منصفانہ اور پائیدار امن کے لئے معقول اُصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تمام عوامل اور اصول اقوامِ متحدہ کی قرارداد نمبر 242 کی حدود میں آتے ہیں' بشرطیکہ اس قرارداد کی صحیح تعبیر و تشریح کی جائے۔

اسرائیلی نقطۂ نظر کے حامی ممالک اس قرارداد کی تشریح میں یوں کہتے ہیں کہ سیکورٹی کونسل کی اس قرارداد میں یہ امکان موجود ہے کہ اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں میں سے کچھ حصے اپنی تحویل میں رکھ سکتا ہے۔

اس تشریح کے لئے قرارداد کی اُس شق کو بطور دلیل استعمال کیا جاتا ہے' جس میں کہا گیا ہے کہ ''اس خطے کے ہر ملک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ محفوظ اور مسلمہ سرحدوں کے اندر امن سے رہ سکے۔'' اس دلیل کا بودا پن اس حقیقت سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرارداد میں من حیث المجموع کہا گیا ہے کہ ''اس کا مقصد اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے اصولوں پر عمل درآمد ہے''۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کا اس سے زیادہ بنیادی اصول اور کیا ہو سکتا ہے کہ طاقت کے بل پر کسی ملک یا اُس کے کچھ علاقے پر قبضے کو تسلیم نہ کیا جائے۔

مزید برآں' کوئی ملک اپنی سرحدوں کی تعیین کا حق تحکمانہ انداز میں' یک طرفہ نہیں جتا سکتی۔ سرحدوں کی تعیین اور حد بندی کا دارومدار بین الاقوامی قانون کی متابعت پر ہے۔ کسی ملک کا دفاع اُس کی تسلیم شدہ سرحدوں پر مبنی ہوتا ہے' نہ کہ اُس کے جارحانہ عزائم پر۔

اور بالآخر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کی سلامتی پہلے آتی ہے؟ گزشتہ 27 سال کی جارحانہ کارروائیوں کے ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں کو اسرائیل کے خلاف اپنی سرحدوں کی سلامتی کی ضرورت ہے۔ اسرائیل کو عربوں کے خلاف اپنی سرحدوں کی سلامتی کی ضرورت نہیں ہے۔

اسرائیل نے جن عرب علاقوں پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے' اُن میں القدس کو مسلمانوں کے دل و جان میں ایک خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ ''القدس'' اسلام' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی مقدس مذہبی روایات کے اتحاد و اجماع کا ایک عجیب اور منفرد نشان ہے۔ ان تمام انبیائے کرام کا مسلمانانِ عالم صدق دلی سے احترام کرتے ہیں۔ القدس ہمارے سینوں پر قرآن مجید کی ان آیات کی صورت میں کھدا ہوا ہے: ''پاک ہے وہ' جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی اس مسجد تک' جس کے ماحول نے اُس کو برکت دی ہے' تاکہ اُسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے''۔ (بنی اسرائیل: 1) اس آیت کا تعلق پیغمبرِ آخر الزماں کی معراج سے ہے' اس لئے ''القدس'' ہمارے رُوح کے رگ ریشے میں سمایا ہوا ہے۔ صلیبیوں کے مختصر سے وقفے کے سوا' یہ شہر مسلمانوں کا شہر رہا ہے..... میں دہراتا ہوں' مسلمانوں کا شہر' 637ء سے لے کر آج تک مسلمانوں کا شہر۔

ساڑھے تیرہ سو برس سے زائد عرصے تک یروشلم مسلمانوں کے پاس' اُن تمام اہلِ مذاہب کی جانب سے بطور امانت رہا ہے جو اس سے عقیدت رکھتے ہیں۔ پس مسلمان اور صرف مسلمان ہی اس کے غیر جانبدار اور اس سے محبت رکھنے والے کسٹوڈین ہو سکتے ہیں' محض اس لئے کہ مسلمان اور صرف مسلمان اُن تینوں مذاہب پر یقین رکھتے ہیں' جن کی جڑیں یروشلم میں ہیں۔

ہم بمسرت تسلیم کرتے ہیں کہ یروشلم تین بڑے عالمی مذاہب سے تعلق رکھنے والے مرد و زن کی محبوب توقعات تمناؤں اور بصیرتوں کا مرکز ہے' لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ دنیا میں آج دو ہزار ملین مسلمان اور عیسائی ہیں' جبکہ یہودی صرف پندرہ ملین ہیں۔ ان پندرہ ملین میں سے بھی اسرائیل سے وفاداری کا دم بھرنے والے یہودیوں کی تعداد تین ملین سے بھی کم ہے۔ حق و انصاف کا وہ کون سا اصول اور وہ کون سا قانون ہے جو اتنی قلیل اقلیت کو عالمی اہمیت و فضیلت کے مقدس شہر پر تسلط و غلبے کا اختیار دے سکے؟ صرف ایک خاص قسم کا احمقانہ جنون ہی گہوارۂ امن کو شر و فساد کی آماج گاہ بنانے کا حق اسرائیل کو دے سکتا ہے۔

میں واشگاف الفاظ میں یہ بات کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اقوامِ متحدہ کے جن اُصولوں اور مقاصد کے تحت ملکی سرحدوں کی تعیین کی جاتی ہے' یروشلم کے ضمن میں اُن کی خلاف ورزی ہم نہیں' اسرائیل کرتا ہے۔ یہ اسرائیل ہی ہے جو اپنے مذہب اور اپنی ثقافت کے حوالے دیتا ہے اور اپنے ناجائز افعال و اقدامات کو جائز ٹھہرانے کے لئے یہود کی یادیں دہراتا اور جذبات بھڑکاتا ہے۔ ایسی کوششوں سے ایسا تنازعہ پیدا ہوتا ہے' جس سے سکون و امن غارت

ہوتا ہے' اور اس کے جلو میں ایک مذہبی جنگ کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔

غیر مذہبی تناظر میں دیکھا جائے تو یروشلم کی حیثیت کا خود یروشلم کے شہریوں کے حق خود اختیاری سے ہے' جن کی بھاری اکثریت عربوں پر مشتمل تھی' جن کو 1948ء میں مغربی علاقے سے بڑی بے رحمی سے نکالا گیا اور اُن کے گھر بار اجاڑ کے انہیں در بدر کیا گیا۔ یروشلم سے یہودی خصوصی نسبت کا دعویٰ رکھتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ طاقت کے بل پر ناجائز قبضے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ یروشلم پر یہودی حق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے یہاں عبادت کا حق بھی چھین لیا جائے۔

ان امور کی روشنی میں ہم کہتے ہیں کہ جہاں تک یروشلم کے مقدس شہر کا مسئلہ ہے' مسلمانانِ عالم کی صفوں میں کوئی شک' رخنہ یا اختلاف نہیں ہے۔ میں اس پلیٹ فارم سے یہ واضح کر دینے کی اجازت چاہتا ہوں کہ ایسا کوئی معاہدہ' کوئی پروٹوکول' کوئی سمجھوتہ جس کے تحت شہر مقدس پر اسرائیلی تسلط کا تسلسل یا شہر مقدس کسی اور غیر مسلم یا عرب ملک کی تحویل میں دینا مقصود ہو' اس کی حیثیت اُس کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہ ہوگی' جس پر یہ تحریر کیا جائے گا۔

یہ دھمکی نہیں ہے۔ لیکن خبردار نہ کرنے سے ایک ایسا سراب پیدا ہوگا' جو مشرقِ وسطیٰ کے دائمی امن کے قیام کے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔ اس سلسلے میں یاد رہنا چاہئے کہ ہمارے سینوں میں ایک ایسی آگ لگی ہے جسے دوسروں کے ماہرانہ اور مدبرانہ حیلے بہانے بجھا نہ سکیں گے۔

عالمی برادری اور خصوصاً اُن ملکوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے' جنہوں نے 1947ء میں فلسطین کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا کر' اُس پر عمل درآمد کرایا تھا۔ انہیں ان ناانصافیوں کی تلافی کرنا پڑے گی جو فلسطینیوں سے روا رکھی گئی ہیں۔ اس سے بڑی اجتماعی انسانی ٹریجڈی اور کیا ہوگی' کہ ایک پوری قوم کو اُن کے وطن سے نکال باہر کر کے' انہیں طرح طرح کی مصیبتوں اور عذابوں کے دکھ جھیلنے کے لئے تنہا چھوڑ دیا گیا' اور یہ کل کی' استعمار کی سیاہ تاریخ کی بات نہیں' ہمارے آج کی بات ہے۔ کیا اُن سے زبردستی چھڑائی ہوئی زمینوں پر' دنیا بھر سے لوگوں کو ترغیب دے دے کر بلا کر' راتوں رات آباد کر دیا جائے' تو خدا لگتی کہئے گا' کیا انہیں غصہ نہیں آئے گا؟ دکھ در رنج سے پیدا شدہ اشتعال کی حالت میں اگر وہ تشدد پر اتر آئیں' تو عالمی برادری کو اُن کا یہ تشدد نہیں دیکھنا چاہئے' بلکہ اُن کے حقوق' اور حقوق کی پاکیزگی کو دیکھنا چاہئے۔ اُن کے حقوق کی پاسداری کرنی چاہئے۔

آج یہاں اس اجتماع میں شریک مسلم ممالک ''اسلامی کانفرنس کے چارٹر'' کے پاسدار کی حیثیت سے' یہ عہد رکھتے ہیں کہ وہ فلسطینی عوام کے جائز حقوق کی بحالی کے لئے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ ہماری یہ ذمہ داری صرف فلسطینی عوام کے لئے' حتیٰ کہ صرف اسلامی برادری کے لئے ہی نہیں' بلکہ پوری انسانیت اور عالمگیر امن کے وسیع تر مقصد کے لئے ہے۔

دوسرا مضمون — پاکستان اور اسرائیل کے اندرونی تعلقات — احمد عرفان

پاکستان کے اندر کے صیہونی

سر فیروز خان نون سے سر ظفر اللہ خان تک

''اسرائیل قائم رہنے کے لئے بنا ہے''۔

یہ خواہ مخواہ کا مفت اعلان نصف صدی قبل' پاکستان کے وزیر خارجہ فیروز خان نون (1893ء-1970ء) نے کیا تھا۔ اس وقت وہ لندن میں تھے۔ 26/ جولائی 1956ء کو مصر نے نہر سویز کو اپنی قومی ملکیت میں لے لیا تھا۔ مصر کے عزائم کو قابو میں رکھنے کے لئے برطانیہ نے 19-21 ستمبر 1956ء کو نہر سویز استعمال کرنے والے ممالک کی ایک کانفرنس لندن میں بلائی تھی' اور یوں فیروز خان نون لندن گئے ہوئے تھے۔ یہ کانفرنس درحقیقت نہر سویز پر قبضہ جمانے کے لئے فوجی حملہ آوری کا پیش خیمہ تھی۔

یہ فوجی حملہ ایک ماہ بعد 29/ اکتوبر 1956ء کو ہوا۔ اس روز اسرائیل کے چھاتہ بردار سینائی میں اُتر گئے جو نہر سویز کے مشرق میں 68 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اگلے روز 30/ اکتوبر کو حکومت برطانیہ نے مصر اور اسرائیل دونوں کو الٹی میٹم دیا کہ وہ نہر سویز سے کم از کم 16 کلومیٹر پیچھے ہٹ جائیں۔ اس الٹی میٹم کا حقیقی مطلب یہ تھا کہ مصری فوج تو نہر کو بالکل غیر محفوظ چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائے گی' حالانکہ نہر پر اُن کا مکمل قبضہ تھا اور دوسری طرف اسرائیلی فوج 68 ویں میل سے آگے بڑھ کر نہر کے 32 کلومیٹر مزید قریب آ جائے گی' اور رہے گی وہ نہر سے 16 کلومیٹر کے فاصلے ہی پر۔ اپنے الٹی میٹم پر عمل درآمد کرتے ہوئے اگلے ہی دن 31/ اکتوبر کو برطانیہ اور فرانس کے جنگی طیاروں نے مصر کے ہوائی اڈوں پر بمباری شروع کر دی۔ انہوں نے بہانہ یہ بنایا کہ وہ حملہ آور اور جس پر حملہ کیا گیا' دونوں کو الگ الگ کرنا چاہتے ہیں' تا کہ نہر محفوظ رہے اور اُسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے۔

پانچ نومبر کو برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ آرمی نے نہر سویز پر حملہ کر دیا' پورٹ سعید پر قبضہ کیا اور نہر کے ساتھ ساتھ جنوب کی جانب' مصر کی سرزمین میں پیش قدمی کرنے لگے۔ لیکن برطانیہ' فرانس اور اسرائیل کی تثلیثی مہم جوئی کا توہین آمیز خاتمہ یوں ہوا کہ امریکا کے صدر آئزن ہاور نے تینوں سازشیوں کو الٹی میٹم دیا کہ وہ فوراً مصر سے نکل جائیں یا امریکی پابندیوں کے لئے تیار ہو جائیں۔ برطانیہ اور فرانس نے تو مؤدبانہ تعمیل کی' لیکن اسرائیل نے ٹال مٹول سے کام لیا اور اپنی فوجیں مصر سے نکالنے میں چار ماہ لگا دیئے۔

فیروز خان نون نے لندن میں منتظمین کانفرنس کو خوش کرنے کے لئے اسرائیل کو تسلیم کر لینے کا جو ''اعلان خوشنودی'' کیا تھا' وہ پاکستان میں اُن کے اہلِ وطن کو پسند نہ آیا۔ قدرتی بات ہے۔ پسند آنا بھی نہیں چاہئے تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پاکستانی عوام کو غالباً اس کا صحیح اندازہ نہیں تھا کہ اُن کے وزیر خارجہ نے اس مکروہ اور ناپاک سازش میں شریک ہو کر کتنی سنگین اور زبردست غلطی کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فیروز خان نون کے اس اعلان کو ''باغیانہ'' سمجھنے کی بجائے ''احمقانہ'' قرار دے کر نظر انداز کر دیا۔

نون صاحب کوئی سیاسی آدمی نہ تھے' نہ انہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل تھی۔ وہ وزارتِ خارجہ کے عہدۂ جلیلہ پر قومی خدمات یا ذاتی قابلیت کی بنیاد پر نہیں' بلکہ سازش اور گٹھ جوڑ سے متمکن ہوئے تھے۔ لیکن اُن کا ایک مضبوط پس منظر تھا' جس سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ اُن کا تعلق پنجاب کے ایک مخصوص جاگیردار اور ٹوڈی گھرانے سے تھا جو اُن ستونوں میں سے ایک تھا جن پر برطانوی سامراج کی عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ انگریزوں کی خدمت کے صلے میں

⇦

انہیں ''سر'' کے خطاب سے بھی نوازا گیا تھا۔ پھر انہیں لندن میں برطانوی ہند کا ہائی کمشنر بھی بنایا گیا اس عہدے پر وہ **1936**ء سے **1941**ء تک فائز رہے۔ لندن سے واپسی پر **1941**ء میں انہیں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن بنایا گیا۔ اس عہدے پر وہ **1945**ء تک مامور رہے۔ وہ اس کونسل کے پہلے ہندوستانی رکن تھے جن کو دفاعی اُمور کے محکمے کا انچارج بنایا گیا تھا۔ **1945**ء میں ادارۂ اقوام متحدہ کے تاسیسی اجلاس میں برطانوی ہند سے دو نمائندے بھیجے گئے تھے ایک فیروز خان نون اور دوسرے ایک اور صاحب جو ہندو تھے۔ سلطنتِ برطانیہ کی وفاداری کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اُن کی بیوی آسٹریا کی یہودن تھی۔ گویا وہ شادی کے رشتے سے آدھے یہودی بن چکے تھے۔

جس زمانے میں وہ لندن میں ہائی کمشنر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے' اُس وقت کے سیکرٹری نوآبادیات لارڈ موئنے **(Moyne)** نے اُن سے کہا کہ عرب فلسطین میں ایک نئی یہودی ریاست بنانے کے لئے ایک اسکیم تیار کرو لیکن اس ترکیب سے کہ برطانوی سامراجیوں پر عربوں کے مخالف یا یہودیوں کے دوست ہونے کا الزام نہ آنے پائے۔ ''حاضر جواب'' کے عادی ''سر'' نے مطلوبہ اسکیم بنا کر اُس وقت کے وزیر ہند لیو پولڈ ایمرے کی خدمت میں پیش کی' جو اتفاق سے وہ بھی یہودی تھا۔ نون صاحب کی تجویز یہ تھی کہ پہلے فلسطین میں عربوں کی ایک فیڈریشن بنائی جائے۔ اس فیڈریشن کے اندر یہودی ریاست بنائی جائے جو اپنی جگہ آزاد اور خودمختار ہو۔ س کے بعد قائم ہونے والی یہودی ریاست کو اُس معاہدے میں شامل کیا جائے' جس کے تحت فیڈریشن قائم کی جائے گی۔

سر نون نے اپنی پیش کردہ اسکیم میں یہ وضاحت کر دی تھی کہ ''پہلے عرب فیڈریشن بنے گی۔ پھر اُس کے اندر مملکتِ اسرائیل اس انداز میں قائم کی جائے گی کہ کوئی مسلم حکمران برطانیہ پر یہ الزام عائد نہ کر سکے گا کہ اُس نے فلسطین کے اندر یا فلسطین کے کسی حصے پر یہودی ریاست قائم کردی ہے''۔ نون صاحب کی مرتب کردہ اسکیم وزیر ہند لارڈ ایمرے نے **10/ ستمبر 1945**ء کو وزیر اعظم چرچل کو بھجوا دی۔ (بمطابق ایف او **372-275**-ای **(65/53/6190**

تاہم **1947**ء کے اوائل تک' تحریکِ پاکستان کا جوش اور ولولہ اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ پاکستان کا قیام ایک کھلی حقیقت نظر آنے لگا۔ ظاہر ہے' اب مناسب وقت آن پہنچا تھا کہ سر فیروز خان نے اپنا ''سر'' کا خطاب' اور دوسرے ایوارڈ اور اعزازات جو انگریزوں نے عطا کر رکھے تھے' وہ بہت سے دوسرے مسلم لیڈروں کے ساتھ حکومت کو واپس کر دیئے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں ایک اخباری بیان جاری کر دیا۔ اس ترکیب سے نون صاحب نے اپنے ٹوڈی ماضی کا ازالہ کر دیا (یہودیت سے اُن کے اندرونی تعلق سے بہت کم لوگ واقف تھے)' اور پاکستان کے اقتدار و حکمرانی کے دائرے کے عین مرکز میں جا کر براجمان ہوگئے۔

دسمبر **1957**ء میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اعلیٰ ترین سیاسی منصب یعنی وزارتِ عظمیٰ کے عہدے تک جا پہنچے۔ اُن کے سیاسی اقتدار کی پتنگ ابھی فضا میں قائم بھی نہ ہوئی تھی کہ انگریزوں کے ایک اور پٹھو سکندر مرزا نے ان کی پتنگ کاٹ دی۔ **7/ اکتوبر 1957**ء کو سکندر مرزا نے آئین منسوخ کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ (بیس روز کے بعد **27** / اکتوبر کو مرزا صاحب کو بھی اُن کے امریکا نواز کمانڈر انچیف ایوب خان نے گھر بھیج دیا)

سلطنت برطانیہ کی وفاداری کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ اُن کی بیوی آسٹریا کی یہودن تھی

لیکن صرف نون صاحب ہی یہود نواز یا سامراجی ایجنٹ نہ تھے' یہاں تو اور بھی کئی جاگیردار اور بیوروکریٹ تھے' جو بڑی عقل مندی سے اخیر وقت میں نئے بننے والے اسلامی ملک کی صفِ اقتدار میں کھڑے ہوگئے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے آخری طوفانی اور نازک مرحلے میں ہر شخص نے حکومت اور نظم و نسق کا ذرا بھی تجربہ رکھتا تھا' اُس نے خود کو پاکستان سے منسوب کرنے کی کوشش کی اور بلاشبہ اُس کا خیر مقدم بھی کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خلوص' محنت اور لگن سے کام کرنے والوں کے ساتھ ساتھ بے شمار موقع پرست کردار بھی اس دوڑ میں شامل ہوگئے۔

پاکستان ایسے شر انگیز اور موقع پرست کرداروں کے باوجود قائم رہا' یہ واقعی ایک معجزہ ہے۔ لیکن آج **56** سال کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان پر فی الحقیقت ایسے عناصر چھائے ہوئے ہیں جن کا اُن مقاصد و نظریات سے دُور کا بھی واسطہ نہیں' جن کی اساس پر یہ نئی جمہوریہ قائم ہوئی تھی۔ نظریاتی طور پر پاکستان کو ایک اسلامی مملکت بننا تھا' قومی ریاست نہیں بننا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے وقت اپنے تشخص کے لئے مسلمانانِ ہند میں نہ کوئی فرقہ واریت کا مسئلہ تھا' نہ کوئی لسانی مسئلہ تھا اور نہ علاقائی خودمختاری کا سوال اٹھتا تھا' اور نہ انہیں اپنے مسلمان ہونے اور کہلوانے کا کوئی احساسِ کمتری تھا۔

وہ ''مسلمان پہلے'' تھے اور بعد میں کچھ اور۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انگریزوں اور ہندوؤں جیسی دو بڑی طاقتوں کی زبردست مخالفت کے باوجود اور ایک گولی چلائے بغیر' نیا ملک حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

وہ ''مسلمان پہلے'' تھے اور بعد میں کچھ اور۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے باوجود کہ وہ ''آزاد'' نہیں تھے' بلکہ تاریخ کی ایک بہت بڑی سلطنت کی محض رعایا تھے' انہوں نے مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں انڈونیشیا تک' کسی مسلم ملک کے خلاف سامراجیوں کی سازش یا حملہ آوری میں شرکت کی نہ ان کو نظر انداز کیا۔

''ایک اُمت'' اور ''مسلمان پہلے'' پاکستان کی ''خارجہ پالیسی'' کا شروع دن سے مرکزی اور بنیادی اصول تھا جو مملکتِ پاکستان کو تحریکِ پاکستان سے ورثے میں ملا تھا۔ چنانچہ فلسطین کی آزادی اور خودمختاری اس ''خارجہ پالیسی'' کا لازمی حصہ تھا۔ جہاں تک بحیثیتِ مجموعی پاکستانی قوم کا حال ہے' صورتِ حال پہلے دن سے آج تک یہی رہی ہے' لیکن بدقسمتی سے پاکستان کے اندر چند ایسے سامراجی چوہے اور دیسی یہودی بھی در آئے تھے' جو چپکے چپکے اپنا کام کئے جا رہے تھے اور اندر ہی اندر اس کی جڑیں کاٹ رہے تھے۔ ان چوہوں نے اپنا کام پاکستان بننے سے پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔

سر ظفر اللہ خان اور پس پردہ

حال ہی میں اسرائیل اور پاکستان کے باہمی تعلقات پر اسرائیل میں ایک تحقیقی کتاب شائع ہوئی ہے:

Beyond the Veil :
Isreal-Pakistan realation

اس کا نام ہی موضوع کی طرف اشارہ کر رہا ہے' یعنی اسرائیل اور پاکستان کے تعلقات ''پس پردہ'' کیسے رہے ہیں۔ مصنف کا نام ہے پی آر کمار سوامی۔ نام سے ہندو معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تحقیقی کام تل ابیب یونیورسٹی کے ''جافے سنٹر برائے سٹریٹیجک سٹڈیز'' کے زیر اہتمام انجام پایا' اور مارچ **2000**ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی اپنی یہود نواز لابی شروع دن سے کیا کیا گل کھلاتی رہی ہے۔

پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان (**1893**ء-**1985**ء) کیا کچھ کر رہے ہیں؟ بہت سوں کو اس کا علم تک نہ ہوگا۔ جب یہ صاحب پاکستان کے وزیر خارجہ (**1947**ء تا **1954**ء) تھے تو فلسطین اور عرب کاز کے لئے اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی مراکز میں اپنی لمبی لمبی اور خطیبانہ تقریروں کی وجہ سے بہت شہرت رکھتے تھے۔ ہمیں آج تک اُن کے بارے میں یہی حسن ظن رہا کہ لمبی تقریروں کے حوالے سے اس بین الاقوامی شہرت یافتہ وکیل نے بے شک ریکارڈ قائم کیا' یہ دوسری بات ہے

کہ مقدمہ جیت نہ سکے۔ اب مذکورہ تحقیقی کتاب ''پس پردہ'' سے انکشاف ہوا کہ موصوف اپنے کیس کے لئے مخلص تھے نہ دیانت دار۔

ظفر اللہ خان کا بھی پس منظر فیروز خان نون سے مختلف نہیں تھا' سوائے اس کے کہ وہ قادیانی گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ قادیانی گروپ انگریزوں کی تخلیق تھی۔ یہ لوگ اپنے ''مذہبی عقیدے'' کی رُو سے سلطنتِ برطانیہ کے وفادار تھے۔

قیامِ پاکستان سے قبل ظفر اللہ خان فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج تھے۔ 1945ء میں (یعنی پاکستان قائم ہونے سے دو سال پہلے) وہ دولتِ مشترکہ کے باہمی تعلقات پر ہونے والی ایک کانفرنس میں حکومتِ ہند کے نمائندے کی حیثیت سے لندن گئے۔ وہاں اُن کی ملاقات جیوش ایجنسی کے سربراہ وائز مین سے ہوئی اور اُن کے مشورے اور تعاون سے چھ روزہ دورے پر فلسطین پہنچے۔ وائز مین نے (جو بعد میں قائم ہونے والی اسرائیلی مملکت کے صدر مامور ہوئے) یروشلم میں اپنے آدمیوں کو تاکید کی کہ ''فلسطین میں ظفر اللہ صاحب کے قیام کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور خوشگوار بنایا جائے' اور ہمارے کام اور مقاصد سے انہیں اچھی طرح متعارف کرایا جائے''۔

چنانچہ ہوا بھی ایسے ہی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب ''جیوش ایجنسی'' کے زیرِ ہدایت ظفر اللہ صاحب نے فلسطین کا دورہ کیا تو ان کی ''خوشگوار'' قلب ماہیت ہوگئی۔ انہوں نے دورہ مکمل کرنے کے بعد وائز مین کو خط لکھا کہ ''میں نے تصور بھی نہ کیا تھا کہ فلسطین کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور اُلجھا ہوا ہے۔ ہم اُمید ہی کر سکتے ہیں کہ اس کا کوئی جائز اور منصفانہ حل جلد نکل آئے گا''۔

ظفر اللہ صاحب نے اپنے خط میں اس امر کی وضاحت نہیں کی کہ فلسطین کے مسئلے میں پیچیدگی کیا تھی جو اِس دورے سے پہلے اُن کے ذہن میں نہ تھی' اور چھ روزہ دورے سے اُن کے ذہن میں آ گئی' اور یہ کہ انہیں یہ اُمید کیسے پیدا ہوئی کہ مسئلے کا کوئی جائز اور منصفانہ حل نکل آئے گا اور وہ بھی جلد۔ انہوں نے اظہارِ حقیقت میں بڑی کفایتِ لفظی سے کام لیا۔ بہرحال جب دو سال کے بعد 29/ نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کر لی' تو اسرائیلی محقق اُوریل ہیڈ (Urial Heyd) نے' جو لندن میں اسرائیلی جاسوس بھی تھا' بیان کیا کہ ''ظفر اللہ خان کے خیالات تبدیل ہو چکے ہیں۔ دمشق میں مجھ سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ فلسطین کے مسئلے کا واحد حل تقسیم ہے' حالانکہ پاکستان کے وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے وہ اقوام متحدہ میں تقسیمِ فلسطین کی شدید مخالفت کر چکے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے عربوں کو مشورہ دیا کہ وہ اسرائیلی ریاست قائم ہونے دیں۔ کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالیں''۔ گویا صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک آدمی کا ایک چہرہ نہ تھا۔ اُس کے دو چہرے تھے۔

وائز مین کو اپنی خفیہ ایجنسی سے جو رپورٹیں موصول ہوئیں' اُن سے ترغیب پا کر وائز مین نے ظفر اللہ خان کو لکھا کہ تقسیم ہند اور تقسیم فلسطین میں کس قدر مماثلت ہے۔ دوسرے لفظوں میں وائز مین نے یہ توقع ظاہر کی کہ پاکستان کے لئے اسرائیلی مؤقف کا سمجھنا دشوار نہ ہونا چاہئے اور اسرائیل کو تسلیم کرنے میں کوئی دقت نہ ہونی چاہئے۔ لیکن پاکستان نے تقسیمِ فلسطین کی قرارداد کے خلاف ووٹ دیا' بلکہ اقوام متحدہ میں اسرائیل کو رُکنیت دینے پر بھی سخت مخالفت کی۔ حتیٰ کہ جب اسرائیل نے پاکستان سے رسمی طور پر اُسے تسلیم کئے جانے کی تحریری درخواست کی' تو پاکستان نے اُس کی رسید تک نہ دی۔

ظاہر ہے' یہ ظفر اللہ خان کے اختیارات سے باہر تھا۔

اس کے باوجود تاریخی قومی اتفاقِ رائے' اور یقیناً وزیرِ اعظم لیاقت علی خان (1895ء-1951ء) کی پیٹھ پیچھے' ظفر اللہ خان اور وزارتِ خارجہ میں اُن کے آدمی صیہونیت کے عزائم و مقاصد کے مفاد میں برابر کام کرتے رہے۔ اُس وقت کے اقوام متحدہ میں اسرائیلی نمائندے ابا ایبان کو (جو بعد ازاں اسرائیل کے وزیرِ خارجہ بنے) جانے کہاں سے ایک ''خوشخبری'' ملی جو انہوں نے یا تو خود ظفر اللہ یا اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب اے ایس بخاری نے دی' بہرحال 1949ء کے اواخر میں تل ابیب میں انہوں نے بتایا کہ ''خوشخبری'' یہ ہے کہ ''اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب انڈیا کو ہراساں کرنے کے لئے اپنی حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کر لے''۔ بہرحال یہ سکیم کاغذات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یا تو پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے یہودنواز افسروں کو اپنی تجاویز آخری منظوری کے لئے کابینہ میں پیش کرنے کی جرأت نہ ہو سکی یا اگر وزیرِ خارجہ نے ہمت کر کے یہ سکیم کابینہ کے سامنے پیش کی ہوگی' تو کابینہ کو اسرائیل کو تسلیم کرنے کی راہ سے انڈیا کو پریشان کرنے کا خوبصورت خیال پسند نہ آیا ہوگا۔

بہرحال' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ظفر اللہ خان اسرائیلیوں کو برابر یقین دلاتے رہے کہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم کرنے والا ہے۔ چنانچہ مذاکرات و مکالمات کے تسلسل میں جب 14/ جنوری 1953ء کو ابا ایبان کی ملاقات ظفر اللہ خان سے ہوئی تو انہوں نے اپنے اسرائیلی ہم منصب کو بتایا کہ لیاقت علی خان کی سابقہ حکومت تو اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حق میں تھی' لیکن موجودہ حکومت' جس کے سربراہ وزیرِ اعظم خواجہ ناظم الدین (1894ء-1964ء) ہیں' اپنی پیش رو حکومت کے مؤقف سے پیچھے ہٹ گئی ہے۔ موجودہ حکومت زیادہ کمزور ہے اور مسلمان انتہا پسندوں کے عوامی دباؤ کی مزاحمت نہ کر سکے گی۔ ظفر اللہ خان نے ابا ایبان سے کہا ''میں اپنی اعتدال پسندی کی وجہ سے خود معتوب رہتا ہوں''۔

لیاقت علی خان کا قتل دو سال پہلے (16/اکتوبر 1951ء) کو ہو چکا تھا۔ اس لئے اُن کی ذات یا پالیسی کے بارے میں غلط بیانی سے کام مشکل نہیں۔ بہرحال یہ سچ ہے یا جھوٹ' ایک بات طے ہے کہ ظفر اللہ خان کی یہودنوازانہ سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی اور وہ دوسرے طریقوں سے صیہونیت کے کاز کے لئے کام کرتے رہے۔

خوشخبری یہ ہے کہ اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب انڈیا کو ہراساں کرنے کے لئے اپنی حکومت پر ڈال رہے ہیں کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کر لے

اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ لیاقت علی خان کسی بھی فوجی بلاک میں شامل ہونے کے خلاف تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے جنوبی کوریا اپنا علامتی طبی امدادی دستہ بھی بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے برعکس اُن کے وزیرِ خارجہ سر ظفر اللہ خان ''مڈل ایسٹ ڈیفنس آرگنائزیشن'' (میڈو) اور اس طرح کے دوسرے امریکی منصوبوں کو رُوبہ عمل لانے کے لئے کام کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مجوزہ غیر اشتراکی بلاک میں اسرائیل کو بھی شامل کیا جائے' جس میں وہ پاکستان' عراق' ایران' ترکی اور دوسرے ملکوں کے ساتھ مل کر بیٹھے۔ ظفر اللہ خان کے نزدیک یہ بات ''ناقابل تصور'' تھی کہ مشرقِ وسطیٰ کی کوئی دفاعی تنظیم اسرائیل کے بغیر کیسے بن سکتی ہے۔

لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ظفر اللہ خان کو اتنی آزادی حاصل ہوگئی کہ انہوں نے فروری 1952ء میں قاہرہ میں کھلم کھلا کہا کہ ''اسرائیل مشرقِ وسطیٰ کے بدن کا ایک لاینفک عضو ہے''۔ انہوں نے مصر پر زور ڈالا کہ وہ اس مسئلے کا کوئی پُرامن حل نکالے۔ دوسرے لفظوں میں عرب اور فلسطین کی سرزمین کو آزاد کرانے کا خیال دل سے نکال دے اور فلسطین پر اسرائیل کے ناجائز قبضے کو تسلیم کر لے۔

لیاقت علی خان کے بعد پاکستان یکے بعد دیگرے متعدد فوجی اتحادوں میں شامل ہوتا چلا گیا۔ مئی 1954ء میں امریکا کے ساتھ باہمی دفاع کا معاہدہ ہوا۔ ستمبر 1954ء میں ساؤتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن (سیٹو) میں اور فروری 1955ء میں بغداد پیکٹ میں شامل

⇦

ہوا۔ عراق میں بادشاہت کی معزولی کے بعد ''بغداد پیکٹ'' کا نام بدل کر ''سنٹو'' (سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن) کر دیا گیا۔ ظفر اللہ خان صاحب نے پاکستان کو سیٹو کا رکن بناتے وقت آرمی سے مشورہ کیا نہ پوچھا نہ بتایا۔ کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے لکھا کہ مجھے تو اس کی اطلاع اس وقت ہوئی جب پاکستان ''سیٹو'' میں شامل ہو چکا تھا۔

مذکورہ کتاب ''پس پردہ'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکی قیادت میں بننے والے ان اتحادوں میں پاکستان کو شامل رکھنے کے منصوبے میں پس پردہ اسرائیلیوں کا ہاتھ تھا۔ اگر امریکا پاکستان کو تھوڑی بہت ''فوجی امداد'' سے نوازتا رہے تو اسرائیل کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ یہودیوں کو ظفر اللہ خان اور ان کے نالائق حواریوں نے یقین دلا رکھا تھا کہ پاکستان کی امریکا سے وابستگی کا مطلب یہ ہے کہ اسرائیل سے اُس کا کوئی جھگڑا نہیں۔ چنانچہ اسرائیلی یہی سمجھتے رہے کہ پاکستان کی امریکا نوازی سے پاکستان کا موقف اسرائیل کے بارے میں نرم رہے گا۔ اور وقت نے ثابت کر دیا کہ اُن کا یہ خیال بالکل درست تھا۔

ظفر اللہ خان پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ کے امیدوار تھے اور اس راہ پر گامزن تھے' لیکن ان کے اپنے کردار اور اُن کے ہم عقیدہ قادیانیوں کی بے ضابطگیوں کی وجہ سے عوام میں اُن کے خلاف اس قدر اضطراب پیدا ہو گیا کہ بالآخر 1954ء میں انہوں نے وزارتِ خارجہ سے استعفیٰ دے دیا' لیکن ان کی خدمات کا صلہ جلد ہی مل گیا۔

7/ اکتوبر 1954ء کو یہود کے ''یوم کپور'' کے موقع پر ان کا انتخاب ہیگ میں واقع ''انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس'' میں بطور جج ہوا۔ اس واقعے کا خود حکومتِ پاکستان کو بھی علم نہ تھا۔ اقوام متحدہ میں اُن کے نام کی سفارش امریکی وزارتِ خارجہ نے کی تھی۔ انتخابی عمل کے وقت اسرائیل کے مندوب ابا ایبان موجود نہ تھے' لیکن اُن کے وفد کے ایک رکن نے کہا کہ ایبان موجود ہوتے' تب بھی وہ ظفر اللہ ہی کو ووٹ دیتے۔

اسرائیل کو تسلیم کیے جانے کی' پاکستان کی ''حقیقت پسندانہ'' حکمت عملی (تل ابیب سے شائع ہونے والی کتاب ''پس پردہ'' کے مطابق) ظفر اللہ کے ساتھ شروع ہوئی اور وزارتِ خارجہ سے اُن کی روانگی کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہوئی' بلکہ بعد میں بھی جاری رہی۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ پاکستان سے کبھی گئے ہی نہ تھے۔ انٹرنیشنل کورٹ میں اپنی ججی کی پہلی میقات مکمل کرنے کے بعد وہ مزید چار سال کے لئے پاکستان کی ''خدمت'' پر مامور ہو گئے۔ اس مرتبہ وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب تھے۔

ظفر اللہ خان کو پاکستان کی رجعت پسندانہ اور اطاعت شعارانہ خارجی پالیسی کا نظریاتی باپ کہنا چاہئے۔

وزارتِ خارجہ اور سفارتی خدمت پر مامور' خام اور اَن گھڑ لوگوں کے ذہنوں اور خیالات کو متشکل کرنے کے سلسلے میں اُن کا اثر ورسوخ بہت گہرا اور دیرپا ثابت ہوا۔ فارن سروس کے پہلے گروپ نے تربیت برطانیہ' کینیڈا اور امریکا میں حاصل کی۔ چنانچہ جب وہ حصولِ تربیت کے بعد اپنے اپنے عہدوں پر فائز ہوئے' تو وہ خوب جانتے تھے کہ مشروبات کے جام کیونکر بنائے جاتے ہیں' کیونکر اچھالے جاتے ہیں' بہرحال اُن کو ایک عظیم قوم کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی قوم کا نام روشن کرنا ہے' دنیا کے سامنے اس کا بھرم اور وقار قائم رکھنا ہے۔

ظفر اللہ خان صاحب کے مستعفی ہونے تک پورا ''پاکستان فارن آفس' عالمی سیاست کے بارے میں قادیانی وصیہونی نظریات میں جذب ہو چکا تھا۔ ظفر اللہ کے جانشین حمید اللہ چودھری کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور اُن کو انگریز پرستی سے کوئی نسبت تناسب نہ تھی۔ تاہم بحیثیت وزیر خارجہ ان کے یک سالہ عہد (26/ ستمبر 1955ء تا 12/ ستمبر 1956ء) میں بھی وزارتِ خارجہ کا موٹو وہی رہا جو سر ظفر اللہ خان اور سر فیروز خان نون کا تھا۔ یہ کہ ''اسرائیل قائم رہنے کے لئے بنا ہے''۔

ایسے حمید الحق چودھری کے بعد آئے سر فیروز خان نون' سرزمین فلسطین کے اندر اسرائیل قائم کرنے کے ایسے عجیب منصوبے کے موجد' کہ برطانوی سامراجیوں پر نہ یہود نوازی کا الزام آئے نہ عربوں کے خلاف ہونے کا۔

1۔ قادیانی گروپ کے بانی مرزا غلام احمد (وفات 1908ء) اپنے آپ کو مسیح موعود اور نبی قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریک کو ایسا پودا کہا جس کی کاشت و پرداخت خود انگریزوں نے کی۔ انہوں نے تلوار توڑ دی اور جہاد کو منسوخ و ممنوع قرار دیا۔ اُن کے بڑے فرزند اور خلیفۂ ثانی نے پیشین گوئی کی تھی کہ تن بہ تقدیر اگر پاکستان بن بھی گیا تو آخر کار بھارت میں ضم ہو جائے گا۔ اس آخری انجام کا انتظار کرنے کی بجائے قادیانیوں نے اس عبوری دور کے جلد خاتمے کا انتظار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سر ظفر اللہ خان کے عمل و کردار پر سخت اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ وہ باؤنڈری کمیشن کے روبرو پاکستان کے وکیل تھے۔ اس کمیشن نے مسلم اکثریتی ضلعے گورداسپور کا بیشتر علاقہ بھارت کے حوالے کر دیا تھا تاکہ بھارت کو جموں و کشمیر میں داخلے کے لئے ایک کھلا راستہ مل جائے۔ چنانچہ تین ماہ کے اندر اندر بھارت نے جموں و کشمیر کے دو تہائی علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔

ظفر اللہ خان کو بذریعہ سفارش قائداعظم (متوفی 1948ء) سے متعارف کرایا گیا تھا۔ انہیں اس خیال کے تحت پاکستان کا پہلا وزیراعظم بنایا گیا تھا کہ وہ برطانیہ کے پرانے آدمی ہیں' ممکن ہے کہ اُن کی تقرری سے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے غیر دوستانہ اور غیر ہمدردانہ سلوک کا کچھ مداوا ہو سکے۔ وائسرائے صاحب اس لئے ناراض تھے کہ قائداعظم نے انہیں پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بنانے سے انکار کر دیا' جبکہ آزاد بھارت نے پہلے ہی اُن کو اپنا گورنر جنرل بنانا قبول کر لیا تھا۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے واضح ہدایات دے رکھی تھیں' کہ اُن کی منظوری کے بغیر پالیسی سے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا جائے۔ لیکن عملاً ظفر اللہ صاحب نے یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ کون سا کیس وزیراعظم کو بھجوائیں اور کون سا نہ بھجوائیں۔ وہ وزارتِ خارجہ کے بزعم خود مختارِ کل بنے ہوئے تھے۔

2۔ ظفر اللہ خان نے اپنی خود نوشت ''تحدیثِ نعمت (ڈھاکا' 1971ء) میں اعتراف کر رکھا ہے کہ انہوں نے یروشلم کے قریبی روسی یہودیوں کی ایک بستی کا دورہ کیا تھا اور جیوش ایجنسی کے نمائندے ڈاکٹر کوہن سے تبادلۂ خیال کیا تھا۔ لیکن انہوں نے وائزمین سے اپنی ملاقات اور اپنے دورے کا احوال خط کی صورت میں لکھنے کا ذکر نہیں کیا۔

تیسرا مضمون — پاکستان اور اسرائیل کے اندرونی تعلقات — احمد عرفان

قادیانی اپنا جال پھیلاتے ہیں

فیروز خان نون دوبارہ نمودار ہوتے ہیں اور اُن کے ساتھ ساتھ ایم ایم احمد بھی

برٹش راج کے صیہونی سر فیروز خان نون کی بطور وزیر خارجہ آمد کے ساتھ ہی' اتفاق سے نہر سویز پر برطانیہ' فرانس اور اسرائیل کا تثلیثی حملہ ہوا۔ پاکستان کے عوام مصر کے زبردست حامی اور اُن تین طاقتوں کی ننگی جارحیت کے سخت خلاف تھے' لیکن ہمارے وزیر خارجہ نے اپنے مخالفین کو پہلے ہی یہ کہہ کر چپ کرا دیا تھا کہ آپ غلط ہوں یا صحیح'

فلسطین پر صیہونی قبضہ قائم رہنے کے لئے ہوا ہے۔

زیادہ تعجب اور اہمیت کی بات یہ ہے کہ وزیر خارجہ کو وزیراعظم حسین شہید سہروردی (متوفی 1963ء) اور صدر اسکندر مرزا (متوفی 1969ء) کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ سہروردی صاحب ایک بے ضرر سے' شوخ و شنگ سیاست داں تھے' اور مرزا صاحب نے اپنے کیریئر کا آغاز صوبہ شمال مغربی سرحد کے قبائلی اضلاع میں برطانیہ کے پولیٹکل ایجنٹ کی حیثیت سے کیا تھا۔ انہیں اپنی وزارت خارجہ کے افسروں کی جانب سے جو 'ایڈوائس' موصول ہوتی تھی' اُس پر صاد کرنے میں اُنہیں ذرا بھی دقت پیش نہ آتی تھی۔

لیکن وزیر خارجہ کی انفرادیت پالیسی کو اپنے اشاروں پر چلانے میں تھی' اور پالیسی ایک آئس برگ کی طرح تھی جو ''پاکستانی رازداری'' کے گہرے پانیوں کے اندر تھی۔ رازداری کو پاکستان میں ایک مقدس چیز خیال کیا جاتا ہے' جس میں مناسب وقت گزرنے کے بعد تاریخ یا آئندہ کی پالیسی سازی کے لئے پبلک ریکارڈ عام کرنے کا کلچر نہیں ہے۔ ہر آنے والی حکومت یہ ضروری خیال کرتی ہے کہ الماریاں پوری طرح مقفل رہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کے بعد میں آنے والے اُن کے اندرونی رازوں سے واقف ہو جائیں۔

اسرائیل میں چھپنے والی کتاب ''پس پردہ'' (Beyond the Veil) خاصی نامکمل ہے اور اس میں صرف چند پاکستانی ماخذ کا ذکر کیا گیا ہے۔ تصویر کو ہر رُخ سے مکمل کرنے کے لئے پاکستان میں دیانت دار اور بے خوف قیادت کا انتظار کرنا ہوگا جو سچائی کے روبرو ہونے سے خوف نہ کھائے۔ بہرحال تل ابیب یونیورسٹی میں ہونے والی تحقیق اور اس پر مبنی کتاب کا مطالعہ بہت تکلیف دہ اور ایک پاکستانی کے لئے توہین آمیز ہے۔

مثلاً ایک واقعہ یوں بیان ہوا ہے۔ یہ 23/دسمبر 1956ء کی بات ہے یعنی سویز پر برطانیہ' فرانس اور اسرائیل کے تثلیثی حملے کے دو ماہ بعد اور سینائی سے اسرائیلی فوج کی واپسی سے ذرا پہلے۔ بھارت کے وزیراعظم جواہر لال نہرو (متوفی 1964ء) کینیڈا کے دورے پر تھے۔ انڈین ہائی کمشنر نے ان کے اعزاز میں استقبالی ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ شرکاء میں دوسرے ملکوں کے نمائندوں کے علاوہ پاکستانی ہائی کمشنر مرزا عثمان علی بیگ اور اسرائیلی سفیر ایم ایلیس کوے بھی تھے۔ کوئی خاص بات نہیں۔ ایسا ہوتا آیا ہے لیکن خاص بات وہ رپورٹ ہے جو اسرائیلی سفیر نے اپنی حکومت کو بھیجی۔ اس رپورٹ میں انہوں نے لکھا:

''..... پاکستانی ہائی کمشنر مرزا عثمان علی بیگ میرے پاس آئے۔ مجھ سے مصافحہ کیا اور گرم جوشی سے کہا: ''مبارکباد کہ آپ کی چھوٹی سی شاندار فوج نے مصریوں کا بھرکس نکال کر شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ اُنہیں افسوس صرف اس بات پر تھا کہ برطانیہ اور فرانس خواہ مخواہ بیچ میں کود پڑے' ورنہ اسرائیلی قاہرہ تک پہنچ جاتے۔''

''میں نے بیگ صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس افسوس کا اظہار کیا کہ اُن کی حکومت اُن کی ہم خیال نہیں ہے اور برابر ہمارے لئے زبردست مخاصمت کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ بیگ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ تمام پاکستانی ہی عربوں کے دوست ہیں نہ اسرائیل کے دشمن' بلکہ بہت سے لوگ میری طرح صدر ناصر کو بھی ایک مصیبت خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ ایک دن آئے گا جب پاکستان اور اسرائیل کے درمیان تعلقات قائم ہونے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔ اُن کا خیال تھا کہ اس کی راہ ہموار کرنے کے لئے ترکی بہترین پوزیشن میں ہے' کیونکہ دونوں ملکوں سے اُس کے تعلقات ہیں۔ میں نے جب اُن سے کہا کہ مجھے اور آپ کو مل کر اس کام میں پیش رفت کرنی چاہئے' تو اُنہوں نے میرے خیال کی تائید کی.....''

عثمان علی بیگ صاحب کو شاید اپنی ذات کی حد تک تو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اس معاملے میں جو بھی چاہیں' رائے رکھ سکتے تھے' خواہ وہ کتنی بھی مضحکہ خیز ہوتی' لیکن یقیناً انہیں یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ اپنی رائے کا اظہار ایک ایسے ملک کے سفیر کے منہ پر کریں جس کو اُن کے اپنے ملک نے تسلیم ہی نہیں کیا۔ انہوں نے تو اپنی رائے کو اس انتہا تک پہنچا دیا کہ خواہش کرنے لگے کہ ''کاش اسرائیلی قاہرہ تک پہنچ جاتے۔''

یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ بیگ صاحب ایسی رائے کے اظہار میں تنہا تھے۔ وہ یقیناً اُس چھوٹے سے سازشی' عیار ''برطانیہ' صیہونیت اور قادیانیت'' کی تثلیث کے گرویدہ' مگر طاقتور ٹولے کی ترجمانی کر رہے تھے جو پاکستان کی وزارتِ خارجہ کو اپنے اشاروں پر چلا رہے تھے' بلکہ آج تک پاکستان کی خارجہ پالیسی اور خارجہ تعلقات کو پراگندہ کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے' جس کا کوئی دوست نہ ہو اور جو بالکل یک وتنہا ہو کر رہ گیا ہو' جیسا کہ پاکستان ہے۔

لیکن دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں اور مکاری بھی اثر دکھاتی ہے۔ اگر پاکستانی سفیر نے اسرائیلی سفیر سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کاش اسرائیل کی چھوٹی سی شاندار فوج قاہرہ تک پہنچ جاتی' تو اس کا بدلہ یہ تھا کہ دس سال بعد ایسے ہی ناپختہ جذبات کا اظہار پاکستان کے لئے مصر کے صدر ناصر نے کیا تھا۔

انڈیا کے صدر رادھا کرشنن نے یہ واقعہ اپنے سابق اے ڈی سی' میجر جی ایل دت کو سنایا: ''جب میں ایتھوپیا کے دورے سے واپسی میں قاہرہ ایئرپورٹ پر اُترا تو خیر مقدم صدر ناصر آئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا' آپ نے لاہور پر (ستمبر 1965ء کی جنگ میں) قبضہ کیوں نہ کیا؟ ہم تو یہ خوش خبری سننے کا انتظار کر رہے تھے۔'' رادھا کرشنن نے میجر دت سے کہا: ''آپ جانتے ہی ہیں' مجھے سچائی چھپانے سے کس قدر نفرت ہے۔ میں صدر ناصر کو یہ نہ بتا سکا کہ پاکستانی اچھوگل نہر کے دفاع میں شیروں کی طرح لڑے تھے۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستانی اور عرب (بالخصوص مصری) ایک دوسرے کے شاکی ہو گئے اور اُن کے دشمن سے اظہار ہمدردی کرنے لگے اور جائز حقوق کی جدوجہد میں اُن کی حمایت نہیں کی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ سچے تھے' لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں پالیسی سازی کا کام تھا' وہ اسلامی اقدار و مقاصد سے تحریک نہ لیتے تھے۔

پاکستان تو اپنے پہلے جائز اور صحیح وزیراعظم لیاقت علی خان کی شہادت (1951ء) کے بعد اپنے تاسیسی خواب سے بتدریج دور ہوتا گیا۔ پالیسی سازی ظفر اللہ خان اور فیروز خان نون جیسے کرداروں' اور اُن کے بچوں' اور اُن کے بچوں کے ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہی۔ ایوب خان (متوفی 1974ء) جو فیروز خان نون اور اسکندر مرزا کے بعد آئے' انہیں پرانوں کے پٹھوؤں کے ساتھ کام کرنا پڑا جو صیہونیت اور سامراجیت کے طرفدار تھے۔ البتہ ایوب خان کے اپنے خیالات پاکستانیت پر مبنی تھے۔

جب نومبر 1960ء میں ایوب خان مصر کے دورے پر گئے تھے تو انہوں نے ایک اعتبار سے معذرت کا اظہار کر دیا تھا۔ ''سوشلسٹ یونین'' کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا: ''سویز کے بحران کے دنوں میں بے شک پاکستان کے بعض نمائندوں نے ناپختہ رویہ کا اظہار کیا تھا لیکن پاکستان کا ہر سمجھ دار شہری مصر پر حملے کی خبریں سن کر سخت دکھ محسوس کرتا تھا اور پاکستانی عوام کی ہمدردیاں مصر کے ساتھ تھیں۔''

ایوب خان نے کمانڈر انچیف کی حیثیت میں بھی اُس وقت کی سیاسی حکومت کو خبردار کر دیا تھا کہ برطانیہ بعض طاقتوں کے ساتھ مل کر مصر پر حملہ کرنے والا ہے اور اس سلسلے میں پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔ نمبر 2 اس وقت کی پاکستانی حکومتوں کا کیا حال تھا' بتانے میں مضائقہ نہیں:

(1) چودھری محمد علی (12/اگست 1955ء تا 12 ستمبر 1956ء)

(2) حسین شہید سہروردی (12/ستمبر 1956ء تا 17/اکتوبر 1957ء)

(3) اسماعیل ابراہیم چندریگر (17/اکتوبر 1957ء تا 16/دسمبر 1957)

(4) فیروز خان نون (16/دسمبر 1957ء تا 7/اکتوبر 1958ء)

ایسی حکومتوں کی وزارتِ خارجہ کمانڈر انچیف کی وارننگ کے ساتھ جو سلوک کر سکتی تھی' وہ کیا۔ اگر کمانڈر انچیف کی باتیں سفارتی ذرائع سے مصر کو بتا دی جاتیں' تو صدر ناصر سخت ردِعمل ظاہر نہ کرتے' جو انہوں نے صدر رادھا کرشنن سے ملاقات میں ظاہر کیا۔

ایوب خان عرب ملکوں کو بھی ''بغداد پیکٹ'' میں شامل کرنا چاہتے تھے' تا کہ اس طرح ایک ''طاقتور مسلم فورم'' بن جائے' لیکن وہ جانتے تھے کہ عرب ممالک ایسے اتحاد کے کیوں مخالف تھے۔ علاوہ ازیں اُن کے پاس اگرچہ منظور قادر (1959ء تا 1962ء) اور سید شریف الدین پیرزادہ (1966ء تا 1968ء) جیسے قابل' مغرب نواز مگر کٹر پاکستانی' وزیرِ خارجہ تھے۔ لیکن پالیسی کے فیصلے کی ڈور قادیانی بیوروکریٹ ایم ایم احمد کے ہاتھ میں تھی۔ احمد صاحب اگرچہ صرف پلاننگ کمیشن کے سربراہ تھے' لیکن اُنہیں سیاسی فیصلوں کو ویٹو کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ کسی بڑے کی سفارش سے انہیں عالمی بنک میں اثر رسوخ حاصل ہو گیا تھا' جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ کسی بھی فیصلے یا معاملے کو صرف اتنا کہہ کر مسترد کر دیتے تھے کہ واشنگٹن کو قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

سید شریف الدین پیرزادہ کا بیان ہے کہ صدر ڈیگال نے ذاتی طور پر ایوب سے 1967ء میں کہا تھا کہ فرانس پاکستان کو بھرپور اور مکمل نیوکلیئر تعاون دینے کے لئے تیار ہے' جس کے بدلے میں وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ فرانس کو شمالی مغربی سرحدی صوبے میں یورانیم کی کان کنی کی اجازت دی جائے اور اس کے منافع میں سے پاکستان کو نصف ملے گا۔ اس پر ایم ایم احمد نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا: ''ہمارے دوست یہ بات پسند نہیں کریں گے۔ ویسے بھی ہمیں اتنی مہنگی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' الفاظ بھی اثر رکھتے ہیں' چنانچہ اپنا کام کر گئے۔ لیکن پاکستان موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکا' ورنہ کم از کم بیس سال پہلے ایٹمی طاقت بن گیا ہوتا' اور اب تک جو بلیک میلنگ اور دھمکی آمیز رویہ اختیار کیا جا رہا ہے' ہم اُس سے بچ جاتے۔

اپریل 1965ء میں ایوب خان ماسکو بھی گئے تھے۔ یہ سوویت روس کا کسی پاکستانی لیڈر کا اوّلین دورہ تھا۔ ایوب خان اس افہام و تفہیم کے ساتھ واپس آئے تھے کہ ''یہ دورہ ہمارے باہمی تعلقات میں ایک اہم موڑ ثابت ہوگا۔ یقیناً تعاون و مفاہمت کے زبردست امکانات موجود ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ رُوس پاکستان کو فوجی امداد دینے پر آمادہ ہو گیا تھا' لیکن دو سال بعد ایوب خان کو اپنے اس کارنامے کو گھٹا کر پیش کرنا پڑا' کیونکہ اس کو بھی اُسی قادیانی بیوروکریٹ ایم ایم احمد نے ویٹو کر دیا تھا۔ فوجی امداد دینے کی پیشکش صدر برزنیف نے اُس میٹنگ میں کی تھی' جس کا خصوصی اہتمام تفریح اور شکار کی غرض سے ماسکو سے باہر ایک جگہ پر کیا گیا تھا۔ اس میٹنگ میں ایوب خان اور پیرزادہ صاحب کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ دوسرے صاحبان حتیٰ کہ سیکرٹری خارجہ کو بھی اس میٹنگ سے باہر رکھا گیا۔ اس کے باوجود صدر ایوب خان جناب ایم ایم احمد سے مشاورت کے پابند تھے' اور یوں وہ ''اہم موڑ'' جو ایوب خان نے روس کے دورے پر دیکھا تھا' پاکستان کی تاریخ میں کبھی نہ آیا۔

قادیانی جماعت کا ایک ''سپیشل مشن'' اسرائیل میں کام کر رہا ہے اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے لگ بھگ 600 قادیانی اسرائیلی فوج میں خدمت انجام دے سکتے ہیں۔'' نمبر 5۔ ایم ایم احمد بھی قادیانی تھے بلکہ قادیانیت کے مبلغ تھے۔ ان حالات میں یہ کہنا مشکل نہیں کہ ایم ایم احمد جیسا بڑا افسر ہو جس کے گرد پوری بیوروکریسی گھومتی ہو' وہ برسرِ کار ہو' ویٹو کا اختیار رکھتا ہو اور پاکستان اور اسرائیل کے درمیان کسی نہ کسی طرح کا تعلق نہ ہو۔

جہاں تک ایوب خان کا تعلق ہے' انہوں نے 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے وقت صدر ناصر کو فوجی امداد کی پیشکش کی تھی' لیکن یہ جنگ بہت جلد ختم ہو گئی۔ کمار سوامی کا یہ خیال درست نہیں کہ یہ حمایت محض ''زبانی کلامی'' تھی (مارچ 1969ء میں ایوب خان اقتدار سے باہر تھے)

یحییٰ خان (متوفی 1980ء) نے چارج ایوب خان سے لیا تھا۔ اُن کا عہدِ حکومت بہت مختصر اور طوفان خیز تھا۔ لیکن سعودی عرب کے شاہ فیصل (متوفی 1975ء) کے ساتھ مل کر انہوں نے اسلامی کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی) کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا' خاص طور پر مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کرنے' فلسطین' سینائی اور جولان کی پہاڑیوں پر اسرائیلی قبضے کے خلاف اُن کا کردار بہت عملی اور مثبت تھا۔ اُن کے عہد میں فلسطین دوستی کی پالیسی میں بظاہر کوئی فرق نہ آیا تھا' حالانکہ ماضی کی طرح اب بھی ظفر اللہ خان کے بچے اور ایم ایم احمد کے چھپے اندرون خانہ اسرائیل کے ساتھ ضرور ساز باز کرتے رہے ہوں گے۔

(1) میجر جی ایل دت کی انگریزی کتاب "With Two Presidents: The Insied Story" مطبوعہ وکاس' دہلی' 1970ء

(2) محمد ایوب خان کی انگریزی کتاب ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس' 1967ء)

(3) یہ دونوں معاملات (فرانس کی جوہری تعاون کی پیشکش اور روس کی فوجی امداد کی پیشکش) مجھے جناب سید شریف الدین پیرزادہ نے ایک نجی ملاقات میں ذاتی طور پر بتائے تھے۔ پیرزادہ صاحب کا کیریئر نصف صدی پر چھایا ہوا ہے۔ قائداعظم کے سیکرٹری سے لے کر اب صدر پرویز مشرف کے مشیرِ آئین تک' وہ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

(4) اسرائیلی ٹی نامانی کی کتاب ''اسرائیل اے پروفائل'' (مطبوعہ پال مال' لندن' 1972ء)

پیر محل میں فری آئی کیمپ

15/ ستمبر تا 5/ اکتوبر 2003ء

المعصوم ہسپتال

پاکستان کے مشہور آئی سرجن اور ڈاکٹر

آنکھوں کا علاج اور آپریشن کریں گے

تشخیص کے بعد جن مریضوں کی آنکھیں آپریشن کے قابل ہوں گی' اُن کو داخل کر لیا جائے گا۔ ہر مریض اپنا بستر ہمراہ ضرور لائے۔ مریضوں کے لئے دوائیں اور عینک مفت فراہم کی جائے گی۔

المعصوم سوسائٹی' فائیٹ رسائٹ' پیر محل

لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو!

ذوالفقار علی بھٹو اور ہنری کسنجر

اس عام مفروضے سے قطع نظر کہ پاکستان کو توڑنے میں ذوالفقار علی بھٹو کا ہاتھ تھا' حقیقت یہ ہے کہ بھٹو صاحب قائداعظم اور قائدِ ملت کے بعد صف اوّل کے عالمی سیاسی رہنما تھے۔ شروع شروع میں تو ان کی صلاحیت کا اندازہ نہ ہو سکا' لیکن ابتدائے شباب میں صدر اسکندر مرزا کے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے اور ان کے ساتھ برج کھیلنے کے سبب ان کے گن سامنے آنے لگے۔ انہوں نے عملی سیاست کا دور سے بغور مشاہدہ کیا' اور پھر ایک دن خود بھی میدانِ سیاست میں کود پڑے۔

رام سوامی کی تصنیف ''پسِ پردہ'' میں صرف یہ دکھایا گیا ہے کہ بھٹو صاحب کے سیاسی خیالات کیونکر وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج پختہ ہوتے گئے۔ ستمبر 1957ء میں جب فیروز خان نون ابھی تک وزیر خارجہ تھے' بھٹو صاحب جنیوا میں ''قانونِ بحر'' پر اقوام متحدہ کی ایک عالمی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اسرائیل کے دستاویزی مواد سے' بھٹو صاحب کے ابتدائی زمانے کی ایک مختلف تصویر سامنے آتی ہے۔ مذکورہ کانفرنس میں ان کی ملاقات اپنے اسرائیلی ہم منصب شاباتائی روزینی سے ہوئی۔ انہوں نے اس کے ساتھ کھانا بھی کھایا۔ روزینی کی والدہ سرگوذفرے ڈیوس کی رشتے کی بہن تھی جو سندھ کے چیف جسٹس رہے تھے۔ روزینی کی والدہ کا کہنا ہے کہ بھٹو عربوں کو پسند نہیں کرتا تھا' اور ان کا انداز سیاست و حکمرانی تو انہیں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس کے باوجود 1947ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اس فیصلے کو وہ نقصان دہ خیال کرتے تھے جس کے تحت فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا' اور پاکستان نے بجا طور پر اس فیصلے کی مخالفت کی تھی۔ تاہم اب ان کا خیال یہ تھا: ''پاکستان کے مفادات کا تقاضا یہی ہے کہ حقیقت (اسرائیل) کو تسلیم کر لینا چاہئے۔''

لیکن 1973ء کے آتے آتے بھٹو صاحب کی رائے بدل گئی تھی' جب وہ پاکستان کے وزیراعظم تھے اور جب مصر کی فوجیں نہر سویز عبور کر گئی تھیں تو وہ بہت خوش ہوئے تھے اور انہوں نے 11/ اکتوبر کو آرمی چیف سے کہا تھا ''سیز فائر سے کچھ حاصل حصول نہ ہوگا۔ ضروری بات یہ ہے کہ وہ عرب علاقے جن پر اسرائیل نے ناجائز اور غیر قانونی قبضہ کر رکھا ہے' وہ خالی کرائے جائیں۔'' کہا جاتا ہے کہ پاکستان ایئر فورس کے پائلٹوں نے ''جنگ اکتوبر'' میں شام کے محاذ پر حصہ لیا تھا۔

بھٹو صاحب نے ''جنگِ اکتوبر'' کے بعد ایک اور تصور پیش کیا' جو اس سے پہلے لیاقت علی خان پیش کر چکے تھے۔ ان کی دختر بے نظیر بھٹو جو دو مرتبہ پاکستان کی وزیراعظم رہ چکی ہیں۔ پہلی مرتبہ 12/ دسمبر 1988ء تا 6/ اگست 1990ء اور دوسری مرتبہ 19/ اکتوبر 1993ء تا 5/ نومبر 1996ء۔ بے نظیر بھٹو کے اپنے الفاظ یہ ہیں: ''انہوں نے اسلامی ممالک کا ایک بلاک بنایا..... دنیائے اسلام کے ممالک کو متحد کیا' جس کی بنیاد پر نہ صرف اسلامی کانفرنس کی تنظیم قائم ہوئی' بلکہ ایک نیا جذبہ اور ایک نیا ادعا پیدا ہوا۔'' سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد وہ غالباً اپنی غلطیوں کا ازالہ بھی کرنا چاہتے تھے۔

بھٹو صاحب نے ایم ایم احمد کو نکالا۔ آرمی سے تمام جانے پہچانے قادیانی جنرلوں کو نکالا اور اس سلسلے میں وہ کچھ کیا' جو اس سے پہلے کوئی سوچنے کی بھی جرأت نہ کرتا تھا۔ قادیانیوں کا قانونی مقام متعین کرنے کے لئے آئین میں ترمیم کی انہیں غیر مسلم قرار دیا گیا' اور پاکستان کو اس کے اپنے ایٹمی بم بنانے کی راہ پر گامزن کر دیا۔

بعد ازاں بھٹو صاحب نے پاکستان ایٹمی انرجی کمیشن کے چیئرمین کو حکم دیا کہ وہ نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبدالسلام کو ''پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نوکلیئر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی'' (پنسٹک) میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں۔ پروفیسر عبدالسلام ایوب خان سے لے کر بعد کے ہر حکومت کے سربراہ کے مشیر سائنس رہے تھے' اور یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگی کہ وہ تیسری دنیا کے کسی ملک کے ایٹمی قابلیت حاصل کرنے کے خلاف تھے۔

قادیانی مسئلے کی طرف بھٹو صاحب کی خاص توجہ غالباً مذہبیات کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ وہ قادیانیوں کو خاص سیاست اور ملکی سلامتی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اسی لئے ان کی پالیسی سے متعلق فیصلوں میں ایک ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایٹمی صلاحیت پیدا کرنے کا فیصلہ اور فوجی حکمت عملی کا فیصلہ' دونوں ساتھ ساتھ متوازی خطوط پر چلے۔

اپنی زبردست ذہانت و فطانت کے باوجود انہوں نے اقتدار بھی کھویا اور جان سے بھی ہار گئے۔ اس لئے کہ انہوں نے بیک وقت دو محاذوں پر لڑنے کی غلطی کی تھی۔ ان کی اندر کے جاگیردار نے انہیں اپنے ہی آدمیوں سے مصالحت کرنے کی اجازت نہ دی' تاکہ اس طرح داخلی محاذ مضبوط ہو جاتا اور ان کے اندر کی بین الاقوامی شخصیت نے ان سب کو ہراساں اور خوف زدہ کیا جو مسلم ممالک اور تیسری دنیا کے ممالک کی خودمختاری کے خلاف کارروائی کرتے تھے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بھٹو جیسا بڑا سیاسی لیڈر' جسے ہنری کسنجر ''سبق سکھانا چاہتا تھا'' اس کا جانشین ایک ایسا شخص ہوا جو دیکھنے میں معمولی اور غیر دلکش لگتا تھا' یعنی چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق (چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت 5/ جولائی 1977ء تا 17/ اگست 1988ء) بھٹو صاحب کی طرح ان کا بھی ایک ماضی تھا۔ وہ اردن کی فوج کے مشیر رہ چکے تھے۔ ستمبر 1970ء میں تنظیم آزادئ فلسطین (پی ایل او) کو کچلنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ بین الاقوامی امور و تعلقات میں وہ اتنے مشاق' تجربہ کار اور گہرے تو نہ تھے جتنے بھٹو صاحب تھے' اس کے باوجود قومی اور بین الاقوامی عزائم و خواہشات میں وہ بھٹو صاحب سے پیچھے نہ تھے۔

امریکہ برابر ضیاء الحق کو بتاتا رہا' سمجھاتا رہا کہ ''اسلامی بم'' بنانے کے خیال کو فراموش کر دیں لیکن اس کے رویئے سے یوں ظاہر ہوتا ہے جیسے انہوں نے امریکیوں کی بات سنی ہی نہیں۔ انہوں نے ہر قسم کے دباؤ کو نظر انداز کر دیا اور اپنے ملک کے ایٹمی پروگرام پر عمل درآمد کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے طور پر روس کے خلاف افغان مجاہدین کی حمایت اور امداد کا فیصلہ کیا' حالانکہ امریکی صدر جمی کارٹر رضامند ہو گئے تھے کہ تاریخی طور پر غیر جانبدار افغانستان بے شک روس کے دائرۂ اثر میں داخل ہو جائے۔ جب امریکیوں نے دیکھا کہ افغان روس کی سپر طاقت کے خلاف جہاد میں کامیابیاں حاصل کر رہے ہیں تو وہ بھی جہاد کے پرچم تلے جمع ہو گئے' اور مجاہدین کو پیچھے ہٹا کر جلد ہی خود ''جہاد'' ہی پر قبضہ کر لیا۔

شیطان کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے کا جو نتیجہ نکلنا چاہئے تھا' وہ نکلا۔ ضیاء الحق اور پاکستان دونوں کے

⇦

خلاف۔ غالباً پہلی مرتبہ امریکہ نے دیدہ دانستہ اور علی الاعلان ''اسرائیلی ماہرین'' کا تعارف کرایا۔ جنہوں نے مجاہدین کو خصوصی تربیت دی اور پاکستان نے ان کو دیدہ دانستہ اجازت دی۔ امریکن اسرائیل کی باقاعدہ دلالی کر رہے تھے۔ اس کے لئے گاہک پھنسا رہے تھے اور پاکستان اور اسرائیل کے درمیان خفیہ تعلقات قائم کرا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ضیاء الحق صاحب کو یہ سمجھاتے رہتے تھے کہ اگر پاکستان اسرائیل کو تسلیم کرلے تو اس سے امریکی حکومت کو کانگرس سے امداد دلوانے میں تقویت پہنچے گی' جہاں اسرائیل نواز قانون ساز پاکستان کے لئے امدادی تجاویز کو مسترد کرا دیتے ہیں۔

''تسلیم کرلیں گے' لیکن پہلے ہمیں رائے عامہ کو تو ہموار کر لینے دیجئے۔'' ضیاء الحق یا ان کا کوئی قریبی رفیق کار امریکیوں کو یہی جواب دے سکتا تھا۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا کہ پاکستانیوں نے اخبارات میں پیر محمد اشرف کا یہ بیان پڑھا کہ وقت آ گیا ہے کہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم کر لے۔ پیر صاحب ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کے نامزد رکن تھے' اور عموماً ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ''ایجنسی کے معزز رکن ہیں۔''

بالآخر پاکستان اور اسرائیل کے اندر ہی اندر بڑھتے ہوئے تعلقات ضیاء الحق اور پاکستان دونوں کے لئے مضر ثابت ہوئے۔ لیکن اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ پاکستان واقعی اسرائیل کو تسلیم کرنے والا تھا۔ ضیاء الحق صاحب کی داستان کا عبرت آموز سبق یہ ہے کہ شیطان کی دوستی کبھی ثمر آور نہیں ہوتی۔

1۔ پی آر کمار سوامی کی تصنیف ''پس پردہ: اسرائیل پاکستان تعلقات'' (مطبوعہ تل ابیب یونیورسٹی 2000ء)

2۔ زیڈ اے بھٹو: ''تقاریر و بیانات'' جلد ہفتم

3۔ بے نظیر بھٹو کا انٹرویو شیٹلے وولپرٹ سے' مصنف ''زلفی بھٹو آف پاکستان'' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 1993ء)

پانچواں مضمون **پاکستان اور اسرائیل کے اندرونی تعلقات** **احمد عرفان**

یہودی اور قادیانی

اب تک پاکستانی صفوں میں موجود ہیں

1988ء میں صدر ضیاء الحق کی ناگہانی وفات کے بعد توقع تھی کہ آزاد خیال بے نظیر بھٹو اب مزید آزادی پا کر صیہونیوں سے ربط ضبط بڑھائیں گی۔ امریکا میں ان کے اکثر دوست یہودی اور بااثر تھے مگر خاتون کو اپنے اوپر اعتماد نہ تھا کہ وہ خارجہ پالیسی میں اس قدر عجیب معکوس قدم اٹھا لیں گی۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ اگر وہ ایسا کرتیں تو انہیں ''غدار'' کا خطاب مل جاتا۔

بہرحال جب حکومت ناتجربے کار اور نابالغ ہاتھوں میں آئی تو خارجہ پالیسی کی رگوں میں موجود پرانے صیہونی عناصر خصوصاً جنیوا اور نیویارک کے پاکستانی سفارت کار غیر رسمی انداز میں میل ملاپ کرنے لگے۔ اب یا تو وزیر اعظم کو ان کی سرگرمیوں کا علم تھا یا وہ ان سے واقف نہیں ہونا چاہتی تھیں یا وہ سب کچھ جانتی تھیں مگر کچھ کر نہیں سکیں۔

اسی زمانے میں امریکیوں نے ماضی کے مقابلے میں زیادہ شدت سے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ ''صیہونی حقیقت'' کو قبول کر لے۔ 6/اگست 1990ء کو بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت اچانک ختم ہوگئی اور ان کی جگہ نواز شریف وزیر اعظم بنے جو بنیادی طور پر صنعت کار تھے۔ اپنی ڈانواڈول حکومت کی حفاظت کے لئے انہوں نے واشنگٹن کی عظیم ترین قوت کو ہر حال میں خوش رکھنے کی کوشش کی اور اس کی خوشامد میں بے نظیر سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے۔ امریکا میں ان کی سفیر' بیگم عابدہ حسین نے ایک بھارتی اخبار ''انڈیا ابروڈ (31/جنوری 1992ء) کا سہارا لیتے ہوئے اعلان کیا کہ پاکستان کا اسرائیل سے کھلم کھلا کوئی جھگڑا نہیں اور جہاں تک اسرائیل سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کا تعلق ہے' ہم اسی راہ پر گامزن ہیں۔

نواز شریف نے بھی پاکستانی عوام کے شدید احتجاج سے ڈر کر ''صیہونی حقیقت'' کو تسلیم نہیں کیا مگر اس وقت سے پاکستان اسی راہ پر گامزن ہے۔ رفتہ رفتہ اصول اور ارادے مٹ رہے ہیں' عدم تحفظ اور ناکافی پن کا احساس اُبھر رہا ہے لہٰذا ممنوعہ سرگرمیوں کا دائرہ کار پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

مصدقہ ذرائع کے مطابق نواز شریف کے بھائی اور پنجاب کے طاقتور وزیر اعلیٰ' شہباز شریف کے صیہونیوں کے ساتھ کاروباری تعلقات تھے۔ اس دور کے وزیر صنعت' شیخ رشید نے کہا کہ اگر ضرورت پڑی تو اسرائیلی صنعت کاروں کو پاکستان بلایا جا سکتا ہے۔ موصوف اب وفاقی وزیر اطلاعات ہیں۔ اخبارات بھی تواتر سے شائع کر رہے ہیں کہ تل ابیب اور اسلام آباد کے مابین تعلقات ہیں مگر حکومت وقت گاہے بگاہے اس بات سے انکار کرتی ہے۔

افواہوں سے قطع نظر پاکستانی وزارتِ خارجہ کے افسروں نے صیہونی حقیقت قبول کرنے کے سلسلے میں سرکاری بیان تیار کر رکھا ہے تاکہ اس پر کوئی فیصلہ ہو جائے' تو وقت ضائع نہ ہو۔ یہ بیان جاری کرنے کا سنہری موقع اس وقت نظر آنے لگا جب عالمی بینک کے سابق نائب صدر معین قریشی کو نوے دن کے لئے نگران وزیر اعظم بنایا گیا۔

محترم وزیر اعظم ایک آسٹریائی خاتون سے شادی کے بعد کئی برس پہلے اپنا وطن چھوڑ چکے تھے۔ جب وہ کراچی کے ہوائی اڈے پر اترے' انہیں سبز پاسپورٹ دینے کے علاوہ شیروانی بھی تھمائی گئی تاکہ وہ ''پاکستانی'' لگ سکیں۔ معین صاحب کا نام ایم ایم احمد نے اس وقت کے سربراہ جنرل عبدالوحید کے سامنے پیش کیا تھا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان صاحب کے ذریعے ان کا دیرینہ خواب پورا ہو سکے گا کیونکہ یہ نوے دن کے بعد اپنے اصلی وطن سدھار جائیں گے۔

لیکن معین صاحب بھی ''تسلیم'' کا لفظ نہ کہہ سکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جنرل عبدالوحید کی مداخلت کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔

معین قریشی نے بعد کو دعویٰ کیا کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر پاکستان کے اندر کے صیہونیوں نے مسلسل اسرائیل سے تعلقات رکھے جو ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کے بعد زیادہ طاقتور ہو چکے تھے۔ بے نظیر بھٹو جب دوسری بار اقتدار میں آئیں' تو انہوں نے وزارتِ خارجہ کو ہدایت کی کہ پاکستانی افسروں اور اسرائیل کے مابین تعلقات کے سلسلے میں رپورٹ کی تشخیص کی جائے حالانکہ اس زمانے میں یہ راز طشت از بام ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ نئی دہلی میں اسرائیلی سفیر الفرائیم ڈویک نے بی بی سی کو بتایا کہ اس قسم کے تعلقات موجود ہیں۔

بے نظیر دراصل متضاد مفادات کے درمیان پھنس کر رہ گئیں۔ ایک طرف وہ عوام کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں اور پھر پاک فوج بھی صیہونی حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ دوسری طرف وہ اپنے امریکی دوستوں کو بھی مطمئن کرنا چاہتی تھیں' جن میں اکثریت بارسوخ یہودیوں کی ہے۔

انہوں نے تردید کی کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں مگر میدانِ جنگ کھولنے کے بجائے انہوں نے چکر کاٹ کر اپنی منزل پانے کی کوشش کی۔ جب قاہرہ میں

اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس ہوئی تو انہوں نے اعلان کیا کہ کانفرنس کے بعد وہ 4 ستمبر 1994ء کو غزہ پٹی میں یاسر عرفات سے ملاقات کریں گی۔ حیرت کی بات ہے کہ اسرائیل نے ان کا استقبال کرنے کے بجائے انہیں جھڑکی دینے کا فیصلہ کیا۔ جب دورے کی تیاری کے لئے مصر میں پاکستانی سفیر اور ان کے لاؤلشکر نے غزہ جانا چاہا تو ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے؟ جب اسرائیلی حکومت کو تسلی بخش جواب نہیں ملا' تو ''انہیں باعزت طریقے سے قاہرہ واپس بھجوا دیا گیا۔''

اس موقع پر اسرائیلی وزیراعظم یزک رابن نے بیان دیا ''جو ملک وہاں (غزہ) جانا چاہتا ہے' اسے پہلے اسرائیل سے تعاون کرنا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے اسرائیل سے تعلقات نہیں اور نہ ہی وہ ہم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ مزید برآں پاکستانی وزیراعظم نے اعلان کیا ہے کہ وہ غزہ جائیں گی لیکن کسی اسرائیلی سے نہیں ملیں گی اور نہ ہی اسرائیل کو تسلیم کریں گی۔ مجھے یہ بتایئے کہ کیا یہ مہذبانہ رویہ ہے؟''

رابن کے نائب وزیر خارجہ یوسی بلیسن نے کہا ''پاکستان اور اسرائیل کے درمیان اقوام متحدہ اور دیگر جگہوں میں تعلقات موجود ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہوتا کہ ان تعلقات کے ذریعے ہم سے رابطہ کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بے نظیر بھٹو نے مہذبانہ انداز میں ہم سے رابطہ نہیں کیا۔''

بے نظیر صاحبہ کو اسرائیلی جھڑکی غیر مہذبانہ مگر سوچی سمجھی تھی۔ گویا یہ پیغام دیا گیا تھا کہ اسرائیل کو بے نظیر بھٹو کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں' بلکہ پاکستان کی کمزور حکومتوں کو' جیسی کہ بے نظیر کی ہے' ضرورت ہے کہ اسرائیل اُن کو تسلیم کرے۔ یہ کمزور حکومت بھی 6/ نومبر 1996ء کو برطرف کر دی گئی۔

بے نظیر صاحبہ نے کئی فاش غلطیاں کیں۔ جب ان کی حکومت آخری ہچکیاں لے رہی تھیں' اس عالم میں بھی انہوں نے اسرائیل کی خوشنودی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مثلاً پہلی خاتون پاکستانی وزیراعظم کی حیثیت سے اسرائیلی اخبار ''ماریف'' کو انٹرویو دیا' ایک بار نیویارک میں تین گھنٹے تک غائب رہیں تاکہ یزک رابن سے ملاقات کر سکیں اور اپنے وزیر خارجہ سردار آصف علی کو اجازت دی کہ وہ صیہونیوں سے ''خاموش سفارت کاری'' کے ذریعے تعلقات رکھیں۔ اس کے باوجود وہ تسلیم کا حرف ''ت'' بھی نہ کہہ سکیں جو ان کے والد کی حکومت گرنے کے بعد آنے والی حکومتوں کے لئے ہوّا بنا ہوا ہے۔

بے نظیر بھٹو نے اپنی حکومت ختم ہونے سے کچھ عرصہ پہلے قومی اسمبلی کو بتایا کہ ان کی حکومت کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ دیگر باتوں کے علاوہ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ''میرے خلاف مقامی اور بین الاقوامی اخبارات میں منظم مہم چل رہی ہے۔''

انہوں نے انکشاف کیا کہ سازش کا ایک کردار حال ہی میں ان سے اسلام آباد میں ملا اور درخواست کی کہ اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے۔ انہوں نے بتایا ''میں نے کہا کہ پہلے اسرائیل فلسطینیوں کے تمام مسائل حل کرے تب ہی ایسا ہو سکتا ہے۔'' اس سے ناراض ہو کر اس کردار نے وال سٹریٹ جرنل (شمار 13/ جون 1994ء) میں میرے خلاف مضمون لکھا۔ مضمون کا عنوان تھا: ''تباہی کے لئے آئی ایم ایف کی چال۔''

اس وقت کے سیکرٹری خارجہ' نجم الحسن شیخ نے بیان دیا کہ یہ کردار واشنگٹن میں مقیم ایک بااثر' پاکستانی پھیری والا تھا جو بے نظیر حکومت سے اس لئے ناراض ہو گیا کیونکہ اسے من پسند فوائد حاصل نہیں ہوئے۔

پاکستانی حکومت سے منصور اعجاز کا تعارف اس وقت اقوام متحدہ میں پاکستانی نمائندے احمد کمال نے کروایا جن کا دعویٰ تھا کہ یہ بااثر پاکستانی امریکی پابندیاں اٹھوانے کے سلسلے میں پاکستان کی مدد کر سکتا ہے۔ مزید براں یہ براؤن ترمیم کے سلسلے میں امریکی ایوان نمائندگان میں قیمتی ووٹ دلوا سکتا ہے' بشرطیکہ ایک کمپنی ریڈا (RADA) کو ڈیڑھ کروڑ ڈالر ادا کر دیئے جائیں جس سے کہ منصور کسی طرح منسلک تھا۔ لیکن اس وقت کی پاکستانی سفیر ملیحہ لودھی نے تجویز منظور نہیں کی کیونکہ ان کے خیال میں ایسا کرنا غیر قانونی تھا۔ نیز وہ کسی ''جال'' میں نہیں پھنسنا چاہتی تھیں۔

واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانے میں بعد میں انکشاف کیا کہ منصور اعجاز نے پاکستانی حکومت پر دباؤ ڈالا تھا کہ اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے۔ وہ کئی بار اسرائیل کا دورہ کر چکا تھا۔ بلکہ ایک بار تو مقبوضہ بیت المقدس کے مشیر کی دعوت پر وہاں گیا۔ 1995ء میں ایک بہت بڑی امریکی یہودی تنظیم نے اسے ''سال کا بہترین انسان'' قرار دیا تھا۔ اعزاز دینے کی تقریب میں احمد کمال نے بھی شرکت کی اور منصور کی فلاحی سرگرمیوں کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیئے۔

اس سے پہلے منصور اعجاز' بے نظیر بھٹو کے لئے اتنا اہم تھا کہ جب اس وقت کے صدر فاروق لغاری مئی 1994ء میں اپنے بیٹے کی گریجویشن کی تقریب میں شرکت کے لئے امریکا گئے تو محترمہ نے انہیں تاکید کی کہ وہ اس ''جینٹل مین'' سے مل کر آئیں۔ اس کے بعد منصور اور بے نظیر کے درمیان ان بن ہو گئی اور دوست رقیب بن گیا۔ اسے پھر اسرائیلی ایجنٹ قرار دیا گیا۔

منصور اعجاز کی شخصیت ایک اور زاویئے سے بھی اہم ہے۔ وہ ''مقدس'' قادیانی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اس کی ماں' لبنیٰ رضیہ اعجاز نذیر حسین خان کی بیٹی ہے جو مرزا غلام قادیانی کے پہلے اور حقیقی تین سو تیرہ پیروکاروں میں شامل تھا۔ مگر منصور کا کہنا ہے کہ وہ قادیانی نہیں۔ دراصل وہ ان قادیانیوں میں شامل ہے جن کی اصلیت پوشیدہ ہے اور وہ بڑے اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

بے نظیر بھٹو کے جانے اور نواز شریف کے دوسری بار آنے سے پاکستان میں صیہونیوں کی سرگرمیاں کم نہیں ہوئیں بلکہ بڑھ گئیں۔ ان صیہونیوں اور قادیانیوں کی مدد موقع پرست پاکستانی بھی کرتے رہے جنہیں فلسطینیوں کے دکھ درد سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ مقدس سرزمین پر صیہونی قبضے سے کوئی سروکار ہے۔

یہ واضح نہیں کہ نواز شریف حکومت اسرائیل کو تسلیم کرنے کے ضمن میں کہاں تک پہنچ گئی تھی مگر ان کی آمد کے بعد اس سلسلے میں یکا یک تیزی آ گئی۔ جلد ہی پاکستانی صیہونیوں کا لشکر نمودار ہوا جس میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے..... مثلاً سیاست دان' صنعت کار' صحافی' سفارت کار' کشمیری مجاہدین' علماء اور چرچ کے نمائندے۔ لگتا تھا کہ ہر کسی کی خواہش تھی کہ وہ پیچھے نہ رہ جائے اور اس دوڑ میں جاسوسی کے اداروں میں شامل لوگ بھی حصہ لے رہے تھے۔

سچ یہ ہے کہ پاکستان اب تک ظفر اللہ خان کے بھوت سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔ اس کے بعد ایم ایم احمد' منصور اعجاز اور کئی دوسرے پوشیدہ قادیانی اور یہودی نمائندے ایوانِ اقتدار میں گھوم پھر رہے ہیں۔

اس تناظر میں جنرل پرویز مشرف کا اقتدار میں آنا بروقت لگتا ہے۔ اسرائیل کے وزیر خارجہ شمعون پیریز نے نیوز ویک (5/ نومبر 2001ء) کو بتایا ''میں نے ان (صدر بش) سے کہا' اب ہم آپ کی حکمت عملی سمجھ گئے ہیں۔ ایک کٹر یہودی کی حیثیت سے میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں مشرف صدر پاکستان کی صحت و تندرستی کے لئے دعائیں کروں گا۔ میرے نزدیک یہ انتہائی غیر متوقع تجربہ ہے۔ (ترجمہ: سید عاصم محمود)

رشتہ درکار ہے

لڑکی' عمر 25 سال' تعلیم میٹرک' راجپوت دیندار فیملی سے تعلق' برسر روزگار دینی گھرانے سے رشتہ درکار ہے۔ ذات پات کی قید نہیں۔

رابطہ: اشرف بیگ' قرآن اکیڈمی' فون: 5869501

☆☆☆

شیخ صدیقی' تعلیم یافتہ' اُردو سپیکنگ فیملی کی اُمورِ خانہ داری میں ماہر' انٹر پاس' 30 سالہ لڑکی کے لئے تعلیم یافتہ برسرِ روزگار رشتہ درکار ہے۔

رابطہ: عمران احمد شیخ

فون: 0303-6451738' 7237961

اسرائیل کے اندر پاکستانی

1968ء کے اواخر میں قدرت اللہ شہاب ''یونیسکو'' کے ایگزیکٹو بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے فلسطین گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے تاثرات اُسی زمانے میں ایک پاکستانی کی حیثیت سے قلم بند کئے تھے۔ اُس مضمون کا ایک حصہ ہدیۂ قارئین ہے۔

فلسطینی مہاجرین کے بچوں کے لئے یونیسکو نے اپنے خرچ پر یروشلم' دریائے اردن کے مغربی کنارے (West Bank) اور غزا کی پٹی (Ghzaza Strip) میں بہت سے سکول کھول رکھے تھے۔ ان سکولوں میں تربیت یافتہ مسلمان اساتذہ بھی یونیسکو کی منظوری سے تعینات ہوتے تھے' اور ان میں جو درسی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ وہ بھی یونیسکو کی جانب سے منظور شدہ ہوتی تھیں' جب یروشلم سمیت ان علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا تو رفتہ رفتہ یہ خبریں آنے لگیں کہ اسرائیلی حکومت نے ان سکولوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ یونیسکو کے متعین کردہ مسلمان اساتذہ کو زبردستی گھر بٹھا دیا گیا ہے۔ ان کو تنخواہ تو باقاعدہ ملتی ہے' لیکن کسی سکول کے قریب تک آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی استاد کسی جگہ حرفِ شکایت زبان پر لاتا ہے تو وہ اپنے بال بچوں سمیت ناقابلِ بیان مظالم اور تشدد کی زد میں آ جاتا ہے۔ ان مسلمان اساتذہ کی جگہ ہر سکول میں اب کٹر یہودی سٹاف فلسطینی مہاجر بچوں کو پڑھانے پر مامور ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سکول سے یونیسکو کی منظور شدہ درسی کتابیں بھی نصاب سے خارج کر دی ہیں' اور ان کی جگہ اب ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں اسلام' سیرت مبارکہ اور عرب تاریخ و ثقافت کے خلاف انتہائی گمراہ کن' غلیظ اور شرمناک پروپیگنڈا ہوتا ہے۔

ایگزیکٹو بورڈ کے ہر اجلاس میں عرب ممالک کے نمائندے اسرائیل کی ان مذموم حرکات کا کچا چٹھا کھولتے تھے اور اپنے ثبوت میں ان کتابوں کے نمونے بھی پیش کرتے تھے جو اس نے یونیسکو کے قائم کردہ سکولوں میں زبردستی رائج کی ہوئی تھیں۔ صحیح حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے دو بار ایک معائنہ ٹیم اسرائیل گئی' لیکن دونوں بار ہمیں یہ رپورٹ ملی کہ عربوں کے الزامات کی تصدیق میں مقامی طور پر کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ ٹیمیں اسرائیلی حکومت کے ساتھ پہلے سے اپنا پروگرام طے کر کے وہاں جاتی تھیں اور معائنہ کے روز اسرائیلی حکام متعلقہ سکولوں میں یونیسکو کے منظور شدہ اساتذہ اور کتابوں کی نمائش کا ڈرامہ رچا دیتے تھے!

ایگزیکٹو بورڈ میں عرب نمائندوں کے ساتھ میرے بڑے گہرے ذاتی تعلقات تھے ہم آپس میں مل جل کر اکثر ایسی تدبیریں سوچا کرتے تھے جن سے اسرائیل کی اس صریح دھاندلی اور اسلام دشمنی کا بھانڈا پھوڑا جائے۔ کافی سوچ بچار کے بعد سب کی یہی متفقہ رائے ہوئی کہ کسی قابل اعتماد شخص کو خفیہ مشن پر اسرائیل بھیجا جائے' اور وہاں سے اسرائیل کے خلاف عائد کردہ الزامات کا ایسا ثبوت فراہم کرے جو ناقابلِ تردید ہو۔ کئی ہفتوں کی چھان بین اور بحث مباحثہ کے بعد انجام کار قرعہ فال میرے نام نکلا۔ میں نے بھی اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ یہ بات نہیں کہ میں جیمز بانڈ کی طرح کسی خطرناک اور سنسنی خیز مہم میں کود کر جان کی بازی لگانے کا شوقین تھا' بلکہ وجہ صرف یہ تھی کہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد اس زمانے میں میرے پاس کچھ فالتو وقت تھا۔ اس کے علاوہ میرے دل میں ایک لگن یہ بھی تھی کہ شاید اسی بہانے میرے ہاتھوں ہزاروں فلسطینی بچوں کی کوئی خدمت ہو جائے جو اسرائیل کے قبضۂ اختیار میں آ کر ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور تھے۔ جن میں دینِ اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک پر انتہائی رکیک' بے بنیاد' غلیظ اور گمراہ کن حملے کئے گئے تھے۔ چنانچہ میرا رابطہ ایک خفیہ تنظیم سے قائم ہو گیا۔ چند ہفتے مجھے پیرس' قاہرہ اور بیروت میں زیرِ تربیت رکھا گیا۔ اس کے بعد ایک جعلی ایرانی پاسپورٹ پر مجھے دس روز کے لئے اسرائیل بھیجنے کا پروگرام طے ہو گیا۔ اس زمانے میں سابق شاہ ایران کی حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا تھا۔

ٹریننگ کے دوران میری سب سے بڑی کمزوری یہ پائی گئی کہ میں اپنا اصلی نام بھلا کا اپنا فرضی ایرانی نام اپنانے میں بار بار چوک جاتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انسان اپنی ذات کے گنبد میں اتنا اسیر ہوتا ہے کہ اپنے نام کی زنجیر تک سے چھٹکارا پانا محال ہے۔ میری اس کمزوری یا معذوری کو بھانپ کر میرے مددگاروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسرائیل میں قیام کے دوران میں سونے سے قطعاً پرہیز کروں۔ انہوں نے مجھے متنبہ کیا کہ نیند کے دوران یا نیند سے اچانک چونک کر میرے ذہن میں اپنے اصلی اور فرضی نام گڈمڈ ہونے کا شدید احتمال ہے۔ اس لئے خود احتیاطی اور عقلِ سلیم کا یہی تقاضا ہے کہ میں وہاں پر اپنا تمام وقت عالم بیداری میں ہی گزاروں۔ نیند سے بچنے کے لئے انہوں نے مجھے ایک خوبصورت سی ڈبیہ (Pillbox) میں کچھ گولیاں دیں۔ پہلے روز ایک گولی۔ دوسرے روز دو گولیاں۔ تیسرے روز تین..... اسی طرح ہر روز ایک گولی بڑھانے سے رات بھر نیند نہ آنے کا قوی امکان تھا۔ ان گولیوں کے علاوہ اس ڈبیہ میں سرخ رنگ کا ایک کیپسول بھی تھا۔ یہ کیپسول دراصل موت کی پڑیا تھی۔ اسے نگلتے ہی انسان آناً فاناً ابدی نیند سو جاتا تھا۔ مجھے حکم تھا کہ اسرائیل میں اگر کسی وقت میرا راز فاش ہوتا ہوا محسوس ہو تو میں فوراً اس کیپسول کو نگل کر جانِ جانِ آفرین کے سپرد کر دوں۔ کیونکہ اسرائیلیوں کے ہاتھ آ کر زندہ درگور ہونا انتہائی ذلت اور اذیت کی زندگی کو دعوت دینا تھا۔ اس کے علاوہ زندہ گرفتار ہونا خفیہ تنظیم کے وجود کو بھی خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

ایک روز میں نے تربیت دینے والے ماہرین سے پوچھا کہ اسرائیل سے میرے صحیح سلامت واپس آ جانے کا کتنے فی صد امکان ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایسی مہمات میں عموماً پچاس فی صد کامیابی اور پچاس فی صد ناکامی کا تناسب رکھا جاتا ہے' لیکن اس تناسب کا تمہارے کیس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ تمہارے اپنے اصلی نام سے مختلف رسالوں اور اخباروں وغیرہ میں تمہاری تصویریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس لئے دوسروں کی نسبت تمہارے پکڑے جانے کا خطرہ بہت زیادہ ہے۔

یہ سن کر میری ہمت کا غبارہ اندر سے پچک گیا۔ موت کے خوف سے میرے دل اور دماغ کی گھگھی بندھ گئی۔ دو تین روز میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں دم سادھے یوں بے حس و حرکت پڑا رہا جیسے چڑیا کا بے بال و پر بچہ گھونسلے سے گر کر زمین پر چونچ کھولے سسک رہا ہو۔ خدمتِ اسلام کا نشہ ہرن ہو گیا اور فلسطینی مہاجر بچوں کی تعلیم کا مسئلہ بھی خوف و ہراس کے ملبے میں دب کے رہ گیا۔ پورے تین روز میں طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتا رہا۔ جنہیں آڑ بنا کر میں کسی طرح اس مہم سے کنارہ کشی اختیار کر لوں' لیکن چوتھے روز ایک اتفاقیہ حادثے نے میرے خوف زدہ اور پراگندہ ذہن کی سوچ کا دھارا بدل دیا۔ میں اپنے ہوٹل سے نکل کر سڑک عبور کرنے کے لئے ایک قریبی ٹریفک لائٹ پر کھڑا تھا۔ جب ہمارے سامنے والی بتی سبز ہوئی تو بہت سے دوسرے راہگیروں کے ساتھ میں نے بھی ایک زیبرا کراسنگ پر سڑک کو پار کرنا شروع کیا۔ عین اس وقت سرخ بتیوں کی جانب سے ایک مرسڈیز کار اچانک نمودار ہوئی اور نہایت تیز رفتاری سے چار راہگیروں کو کچلتی ہوئی کچھ

دور آگے جا کر رک گئی۔ کار کو ایک خاتون چلا رہی تھی جو کسی خطرناک نشے میں مدہوش تھی۔ دو راہگیر تو موقع پر ہی ہمارے سامنے ہلاک ہو گئے۔ باقی دو شدید زخمی ہو کر سڑک پر اوندھے پڑے تھے۔ میں نے حساب لگایا کہ اگر میں دو یا تین فٹ آگے ہوتا تو یقیناً میرا شمار بھی مرنے والوں میں یا زخمی ہونے والوں میں ہوتا۔ اس المناک جائے وقوعہ پر دو لاشوں اور دو قریب المرگ ڈھانچوں کے درمیان کھڑے کھڑے میرے منطق گزیدہ دماغ کو زندگی میں پہلی بار اس بات کا یقین آ گیا کہ اگر موت مقدر میں ہے تو اسرائیل جانے یا نہ جانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں' بلکہ یہاں پیرس میں اپنے ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر سبز ٹریفک لائٹ کی حفاظت میں زیبرا کراسنگ پر چلتے ہوئے بھی موت کا فرشتہ میرا گلا دبوچنے کے لئے آناً فاناً غیب سے نازل ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد میری خود اعتمادی کسی قدر بحال ہوئی' اور میں نے اپنی ٹریننگ کا باقی حصہ بھی خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔ چند آزمائشی مشقوں میں پورا اترنے کے بعد میں نے عفت اور ثاقب کے نام ایک مختصر سا وصیت نامہ لکھ کر اس مہم کے معتمد کے حوالے کیا' اور پھر ایک روز پیرس کے اورلی ہوائی اڈے پر تل ابیب جانے کے لئے اسرائیلی ہوائی کمپنی (ElAl) کے جہاز پر سوار ہو گیا۔

جہاز میں بیٹھتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں واقعی سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہوں یہ خیال آتے ہی میرے دل پر بزدلی' افسردگی اور مُردنی کی برف جم گئی۔ خوف و ہراس نے ایک بار پھر مجھے اپنی گرفت میں دبوچ لیا۔ جب جہاز کا دروازہ بند ہوا تو میری حالت اس لاش کی طرح ہو گئی جس کے اوپر پتھر کی سلیں اور منوں مٹی ڈالنے کے بعد سب لوگ اسے اکیلا چھوڑ کر قبرستان سے واپس چلے گئے ہوں۔ زمین پر تاحد نگاہ پھیلے ہوئے مکانوں کے مکینوں پر مجھے رشک آنے لگا جو ہر خوف اور خطرے سے بے نیاز اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہنسی خوشی وقت گزار رہے تھے۔ مجھے بے اختیار اپنی بیوی' اپنا بیٹا' اپنا بھائی' اپنی بہن' اپنے سارے عزیز و اقارب اور دوست یاد آنے لگے' جو ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ ایک ایک کر کے ماضی کی کسی بے تھاہ سرنگ میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اگر یہ جہاز اسرائیلی ہوائی کمپنی کا نہ ہوتا تو شاید میں اپنی نشست پر کھڑا ہو کر زور زور سے چیخیں مار کر رونے لگتا۔

ہوائی جہاز تھوڑی دیر کے لئے روم کے ہوائی اڈے پر بھی اترا۔ ٹرانزٹ لاؤنج کی قد آدم کھڑکیوں سے میں نے باہر جھانکا تو دور دور تک ملک ملک اور کمپنیوں کے طرح طرح کے ہوائی جہاز قطار در قطار کھڑے نظر آئے۔ ان میں ایک جگہ پی۔ آئی۔ اے کا ڈی سی۔ 10 بھی دکھائی دیا۔ پی آئی اے کے ہوائی جہاز کی جھلک میرے اضطراب پر تسلی اور سکون کی شبنم بن کر ٹپکی۔ اس سکون بخش منظر نے میرے خوف زدہ وجود میں تحلیل نفسی کی ایسی اگربتی سلگا دی کہ معاً خجالت' ندامت' تشکر اور خود اعتمادی کے ملے جلے احساس سے میرا دل بھر آیا۔ ایک قریبی ٹائلٹ میں گھس کر میں نے اندر سے کنڈے چڑھا لی۔ پہلے خوب رویا۔ جب دل کی بھڑاس اچھی طرح نکل گئی' تو میں نے اپنے پاؤں کا جوتا کھولا اور اسے ہاتھ میں لے کر ساتھ آٹھ بار اپنے سر پر زور زور سے مارا۔ غالباً اس جھاڑ پھونک سے خوف و ہراس اور کمزوری اور بزدلی کے بھوت کا سایہ میرے سر سے اتر گیا!

تل ابیب کے ہوائی اڈے پر کسٹم والوں سے فارغ ہو کر جب میں اپنا سامان لئے باہر نکلا تو اسرائیل کی ٹورسٹ کارپوریشن کے ایک خوش لباس نوجوان نمائندے نے لپک کر مجھے خوش آمدید کہا۔ گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے دبی آواز سے وہ شناختی الفاظ بھی ادا کئے جن کے متعلق مجھے پیرس میں آگاہ کر دیا گیا تھا۔ جواباً میں نے بھی اپنے مقرر کردہ شناختی الفاظ دہرائے۔ اس کے بعد ''مصطفےٰ'' نے اگلے دس روز کے لئے میرا مکمل چارج سنبھال لیا۔

''مصطفےٰ'' اس نوجوان کا کوڈ کا نام تھا۔ چھبیس ستائیس برس کا یہ پڑھا لکھا نوجوان کئی سال سے جان کی بازی لگا کر اسرائیل میں آزادیٔ وطن کی ظاہر طرح طرح کے خفیہ فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک بجلی کی طرح کوندتی تھی اور اس کی رگ رگ میں جہاد کا جوش اور جنون سیماب کی مانند بے چینی سے گردش کر رہا تھا۔ دن رات وہ میرے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا تھا اور قدم قدم پر انتہائی شفقت اور احترام سے میری رہنمائی اور خدمت کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے اخی اور سیدی کے القاب سے پکارتا تھا۔ اسی کے زیر اہتمام میں یونیسکو کے قائم کردہ بہت سے سکولوں میں گیا اور 113 شرانگیز کتابوں کے نسخے حاصل کئے جو اسرائیلیوں نے یونیسکو کے نصب شدہ نصاب کی جگہ وہاں پر زبردستی رائج کر رکھے تھے۔ ان کتابوں پر میں نے ہیڈ ماسٹروں اور کئی دیگر اساتذہ کے آٹوگراف بھی لئے۔ یہ وہ یہودی ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ تھے جنہیں اسرائیلیوں نے یونیسکو کو دھوکہ دے کر مسلمان اساتذہ کی جگہ تعینات کر رکھا تھا۔ کئی جگہ میں نے ان کی بہت سی خفیہ تصویریں اتاریں۔ ایک دو سکولوں میں وہاں کے یہودی سٹاف کے ساتھ میرا گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا۔ ایک سکول میں ایک فلسطینی بچے کو انتہائی بیدردی کے ساتھ نہایت کڑی اور ذلت آمیز سزا مل رہی تھی۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنی کتاب کا وہ حصہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا جس میں رسولِ کریم ﷺ کی شان میں انتہائی گستاخ الفاظ درج تھے۔ ہم نے اپنے خفیہ کیمرے کی مدد سے اس سین کی پوری فلم اتار لی جس کی لمبائی دو سو فٹ سے کچھ اوپر تھی۔

اسرائیل میں آئے ہوئے مجھے پانچواں روز تھا کہ اچانک ''مصطفےٰ'' بولا ''یا اخی' اب تک تو تم نیند کے بغیر ٹھیک گزارہ کر رہے تھے' لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے قدم لڑکھڑانے لگے ہیں اور تمہاری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے ہیں۔''

''اب کیا ہو سکتا ہے'' میں نے کہا۔ ''ابھی پانچ روز باقی ہیں کام تو ختم کرنا ہے۔''

اس وقت تو وہ مسکرا کر چپ ہو گیا' لیکن نماز عشاء کے وقت مجھے ایک ٹیکسی میں بٹھا کر مسجد اقصیٰ لے گیا۔ اس زمانے میں عشاء کے بعد اگلی اذان تک مسجد کے دروازے مقفل ہو جاتے تھے۔ الاقصیٰ کے کلید بردار ''مصطفےٰ'' کے ہمراز تھے۔ ان کے ساتھ ساز باز کر کے نماز کے بعد اس نے مجھے اندر اکیلا چھوڑ کر باہر تالا لگوا دیا اور یہ ہدایت کر گیا کہ میں رات بھر خوب اطمینان سے اپنی نیند پوری کر لوں۔ فجر کے بعد وہ مجھے اسی جگہ آ ملے گا۔

قبلہ اوّل کی چار دیواری کے اندر جب میں اکیلا رہ گیا' تو تاریخ اور تقدس کے ایک مہیب سناٹے نے مجھے سر سے پاؤں تک غڑاپ سے نگل لیا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی پاکیزہ شیش محل میں ایک کتا غلطی سے بند ہو گیا ہے۔ لرزے کے بخار کی طرح میرے تن بدن پر کپکپی طاری ہو گئی اور دانت بے اختیار کٹ کٹ بجنے لگے۔ مرگی کے مریض کی مانند تشنج میں گرفتار ہو کر آناً فاناً لڑھکتا ہوا میں ایک ایسی ٹائم ٹنل (Time Tunnel) میں جا گرا جہاں پر نسلِ انسانی کی ہزاروں سال کی خوابیدہ تاریخ انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی اور کہکشاں کی طرح جگمگ جگمگ کرتی ہوئی شاہراہوں پر بڑے بڑے ذی شان پیغمبروں کے قدموں کی خاک سے نور کے چشمے پھوٹنے لگے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام' حضرت داؤد علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور پھر اللہ کے آخری نبی خاتم النبیین رحمتہ اللعالمین حضرت محمد ﷺ جنہیں اللہ کی پاک ذات شب کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی تا کہ ان کو اپنے کچھ عجائباتِ قدرت دکھائے۔ اسی مسجد میں فرش سے عرش تک نوری فرشتوں نے وہ راستہ منور کر دیا جس پر نبوت کا سفر اختیار کر کے حضورؐ نے رسالت کی معراج کو پایا۔'' سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔ جب اس سدرۃ المنتہیٰ کو لپٹ رہی تھیں جو چیزیں لپٹ رہی تھیں۔ نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے۔''

خبر نہیں یہ وصال کی گھڑی تھی یا فراق کا لمحہ' کہ عین اس وقت فضا میں اذان کی آواز گونجی اور بچپن میں کہیں پڑھا ہوا یہ پرانا شعر مجھے بے اختیار یاد آ گیا۔

خدا سمجھے موذن سے کہ ٹوکا عین عشرت میں
چھری مجھ پر چلا دی نعرۂ اللہ اکبر سے

خدا کا شکر ہے کہ پیرس واپس آنے کے بعد اسرائیل سے لائی ہوئی میری شہادتوں کو یونیسکو والوں نے تسلیم کر لیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے ایسے اقدامات کئے کہ متعوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کے قائم کردہ تمام سکولوں میں عربوں کا منظور شدہ درسی نصاب از سرِ نو رائج ہو گیا اور اسرائیل کی لگائی ہوئی 113 شرانگیز کتابیں بھی منسوخ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ آئندہ اس صورتِ حال پر کڑی نظر رکھنے کے لئے قابلِ اطمینان بندوبست کر دیا گیا۔

میری اس حقیر سے خدمت کے اعتراف کے طور پر پیرس میں متعین تمام عرب سفیروں نے ایک مشترکہ تقریب منعقد کی۔ صدر ناصر کا ایک ذاتی نمائندہ اس تقریب میں شریک ہونے کے لئے خاص طور پر قاہرہ سے آیا۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد میں ان دونوں بیروزگار تھا۔ اس لئے کئی سفیروں نے اشاروں کنایوں میں اور چند ایک نے کھلے بندوں مجھے منہ مانگے انعامات نذر کرنے کی پیشکش کی۔ ان سب کی خدمت میں میرا صرف یہ جواب تھا کہ یہ معمولی سا فرض میں نے کسی دنیاوی لالچ یا غرض و غایت سے ادا نہیں کیا۔ میں اسے اپنے لئے محض توشۂ آخرت سمجھتا ہوں۔

اس واقعہ کے ایک برس بعد انگلستان کے گاؤں وگمور میں ایک رات میں اپنے گھر سو رہا تھا۔ آدھی رات کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب ''مصطفےٰ'' بیروت کے ایک ہسپتال سے بول رہا تھا۔ ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ اس طرح کی تھی۔

''ہیلو مصطفےٰ تم کیسے ہو؟''

''الحمدللہ خوش و خرم ہوں۔''

''اگر خوش و خرم ہو تو ہسپتال سے کیوں بول رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بلڈ کینسر تشخیص ہوا ہے علاج کروا رہا ہوں۔''

''توبہ توبہ بلڈ کینسر کی بات تم ایسے کر رہے ہو جیسے معمولی زکام ہو۔ تم اصلی بات بتاؤ کہ تمہارا حال کیسا ہے؟''

''یا اخی اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اندازہ ہے کہ ان شاء اللہ میں بہت جلد اپنے خالق سے جا ملوں گا۔''

''تم موت کا ذکر یوں کر رہے ہو جیسے کسی پکنک پر جا رہے ہو۔ علاج تو سنجیدگی سے کروا رہے ہو نا؟''

''الحمدللہ علاج خوب ہو رہا ہے ماشاء اللہ میں راضی برضا ہوں۔ تم میرے لئے حسنِ خاتمہ کی دعا کرنا۔ میرے بعد اگر میرا والد تمہیں کوئی خط لکھے تو اسے جواب ضرور دینا۔''

چند ہفتے بعد مجھے اس کے والد کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ ''مصطفےٰ'' مرحوم ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی یاد میں وہ بلڈ کینسر کے نادار مریضوں کے علاج اور مدد کے لئے دس لاکھ امریکن ڈالر کا ایک فنڈ قائم کر رہے ہیں۔ جس کا انتظام ایک تین رکنی مینجنگ کمیٹی کے ہاتھ میں ہوگا۔ ''مصطفےٰ'' مرحوم کی وصیت تھی کہ اس کمیٹی کا ایک رکن مجھے نامزد کیا جائے۔

میں آٹھ برس تک اس فنڈ کی منتظمہ کا ممبر رہا۔ اس عرصہ میں بلڈ کینسر کے 1154 نادار مریضوں کو قومیت اور مذہب کے امتیاز کے بغیر طبی اور دیگر مالی سہولتیں فراہم کی گئیں پھر ''مصطفےٰ'' کے والد گرامی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد بیروت کے فسادات اور خانہ جنگی کے دوران ''مصطفےٰ'' کے نام پر یہ صدقہ جاریہ بھی رفتہ رفتہ بند ہو گیا۔

صوم و صلوٰۃ کے پابند جواں سال ''مصطفےٰ'' کی سیماب صفت شکل و صورت آج تک میری آنکھوں کے سامنے گھومتی پھرتی نظر آتی ہے۔ کروڑ پتی باپ کے اس اکلوتے مجاہد بیٹے نے اسرائیل میں دس روز تک لگاتار میری خدمت گھریلو ملازم کی طرح کی۔ ہم جہاں کہیں ستانے کے لئے کچھ دیر بیٹھتے تھے۔ وہ فوراً اپنے بریف کیس سے ایک جھاڑن نکال کر میرے بوٹ صاف کر دیتا تھا۔ اسرائیل سے واپسی کے وقت میرے پاس آٹھ اسرائیلی پاؤنڈ بچے ہوئے تھے جو اس زمانے میں تقریباً 18 روپے کے برابر تھے۔ حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر میں نے یہ ساری رقم ٹپ کے طور پر ''مصطفےٰ'' کو دے دی۔ اس نے اسے وصول کر کے آنکھوں سے لگایا اور انتہائی اظہارِ تشکر کے ساتھ جیب میں ڈال لیا۔ ''مصطفےٰ'' کا اصلی بھید تو مجھے معلوم نہیں لیکن جب کبھی یہ چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آتے ہیں تو اس کے کردار کی عظمت کی حرارت میرے وجود پر جمی ہوئی بے حسی کی برف کو کسی قدر پگھلا دیتی ہے اور اس کی جدائی کا احساس ایک بار پھر میرے دل و دماغ کی ظلمت پر چند لمحوں کے لئے ایک ناقابلِ بیان غمگینی، رنگینی اور نور کی پھواری برسا جاتا ہے۔

کیا مسلمان امت آج اللہ کے عذاب کی زد میں ہے؟
قرآن حکیم کی رو سے اللہ کا قانونِ عذاب کیا ہے؟
بنی اسرائیل اور موجودہ امت مسلمہ میں مماثلت کس اعتبار سے ہے؟
سابقہ امت مسلمہ بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے چار ادوار کے مقابلہ میں
موجودہ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے چار ادوار کون کون سے ہیں؟
قرآن و حدیث کی روشنی ''آنے والے دور'' کی کونسی واضح تصویر سامنے آتی ہے؟
اور
کیا ''خلیج کی جنگ'': ''جنگوں کی ماں'' ہے؟
ان اہم سوالات کے جوابات پر مشتمل
امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کی کتاب
سابقہ اور موجودہ
مسلمان امتوں کا ماضی حال اور مستقبل
اور
مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری
آج ہی اپنی کاپی بک کرائیں —— قیمت: 60 روپے
ملنے کا پتہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور**
36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

ناگزیر مفاہمت

مرزا ایوب بیگ

راقم اس کالم میں ایک سے زائد بار تحریر کر چکا ہے کہ صدر مشرف بمع جمالی حکومت اور مجلس عمل کے لئے کسی آئینی پیکج پر متفق ہونا دونوں اطراف کی مجبوری اور ناگزیر ضرورت ہے۔ اگرچہ ابھی بھی یہ اتفاق حتمی صورت میں سامنے نہیں آیا لیکن راقم کو یقین ہے کہ یہ اتفاق ہو کر رہے گا چاہے عارضی طور پر مذاکرات میں کچھ اور نشیب و فراز آئیں۔ کیونکہ مذاکراتی ٹیموں کے مابین طے پانے والے معاملات اور جن نکات پر پیش رفت ہوئی ہے یہ سب کچھ جماعتوں کے سربراہان کے سامنے پیش کیا جائے گا اور آخری فیصلہ کا اختیار ان سربراہان کے پاس ہے۔ یہ مفاہمت ان کے لئے اس لئے ناگزیر ہے کہ طرفین جانتے ہیں کہ اگر یہ نظام ناکام ہو گیا' اسمبلیاں ٹوٹ گئیں تو دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ صدر مشرف سخت گیر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن جائیں اور دوسری یہ کہ دوبارہ انتخابات کروا دیئے جائیں۔

بہر دو صورت مشرف سخت خطرے میں گھر جائیں گے مارشل لاء کو امریکہ اور مغرب پسند نہیں کرے گا اور دوسرے جرنیل بھی نہیں چاہیں گے کہ ایک ہی جرنیل بار بار مارشل لاء لگائے اور اگر دوبارہ انتخابات کرائے گئے تو مسلم لیگ (ن) اور پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار میں آنے سے روکا نہیں جا سکتا اور یہی مسئلہ ایم ایم اے کا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر غیر جانبدار انتخابات ہو گئے تو انہیں اسمبلی میں بمشکل چند نشستیں دستیاب ہوں گی ان کے لئے بھی انہیں مسلم لیگ (ن) اور پی پی پی کا تعاون درکار ہو گا۔ لہٰذا ان اسمبلیوں کی مدت پورا کرنا طرفین کی مجبوری ہے۔ بہر حال مذاکرات کے آخری راؤنڈ 16 ستمبر کو لاہور میں ہوئے۔ حکومتی ٹیم میں چوہدری شجاعت حسین' الیس ایم ظفر اور صدر مشرف کے قریبی دوست طارق عزیز شامل تھے جبکہ ایم ایم اے کی طرف سے لیاقت بلوچ اور حافظ حسین احمد شریک ہوئے۔ مذاکرات کے بعد مشترکہ پریس کانفرنس میں طرفین نے اعلان کیا کہ نہ صرف متنازعہ امور پر مثبت پیش رفت ہوئی ہے بلکہ صحیح معنوں میں بریک تھرو ہوا ہے۔ جن امور پر ابھی تک اختلاف تھا ان میں سرفہرست صدر اور آرمی چیف کے عہدوں کو الگ الگ کرنا اور صدر مشرف کے وردی اتارنے کی تاریخ کا تعین تھا۔ علاوہ ازیں حکومت کو برطرف کرنے کا صدارتی اختیار' صدر کے دوسرے صوابدیدی اختیارات' ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر' آئین کے چھٹے شیڈول میں لوکل باڈیز قوانین اور صدر کے انتخاب کا طریقہ کار متنازعہ تھا۔ مشترکہ پریس کانفرنس میں بھی یہ محسوس کیا گیا کہ صدر کی وردی اترنے کی تاریخ اور صدر کے انتخاب کے طریقہ کار پر اختلافات باقی ہیں۔ حافظ حسین احمد نے واضح طور پر کہا کہ پیکج میں وردی اترنے کی تاریخ درج ہو گی جبکہ چوہدری شجاعت حسین نے ایک بار پھر کہا کہ وردی کا مسئلہ طے شدہ ہے۔ سول صدر کی حیثیت سے منتخب ہونے پر بھی ابھی اختلاف باقی ہے حکومتی پارٹی کا کہنا ہے کہ صدر ریفرنڈم کے ذریعے منتخب ہو چکے ہیں اب زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ صدر اپنے الیکٹرول کالج سے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیں جبکہ ایم ایم اے کا مؤقف ہے کہ صدر کا آئینی طریقہ سے باقاعدہ انتخاب ہوا اگرچہ ایم ایم اے بار بار یہ یقین دہانی کرا چکی ہے کہ وہ اس انتخاب میں صدر مشرف کو ووٹ دیں گے۔

اگرچہ ایم ایم اے نے واضح طور پر اعلان کیا کہ مشرف + جمالی حکومت سے اس کا تعاون کرنے کا صرف اور صرف یہ مقصد ہے کہ ملک کو آئینی بحران سے نکالا جائے اور مصالحت ہو جانے کی صورت میں بھی وہ کسی طرح بھی حکومت کا حصہ نہیں بنے گی پھر بھی خالص جمہوری اصولوں کو مدنظر رکھا جائے تو کسی فوجی طالع آزما سے مذاکرات اور مصالحت کرنا درست معلوم نہیں ہوتا پھر بھی ایم ایم اے کی یہ دلیل وزن رکھتی ہے کہ فوجی آمر سے حکومت چھینی نہیں جا سکتی اور اگر مسلم لیگ (ن) اور پی پی پی کے کہنے پر فوجی آمر سے چھینا جھپٹی کی گئی تو ایسی صورت میں ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچ سکتا ہے پھر یہ کہ ان دونوں جماعتوں کا اصل مسئلہ اپنی قیادت کو ملک میں لانا ہے اور شخصیات کی خاطر ملک کو نقصان پہنچنے کا خطرہ مول لینا فوج کے ساتھ محاذ آرائی ایسے وقت میں انتہائی مہلک ثابت ہو سکتی ہے جبکہ بین الاقوامی صورت حال ایسی ہے کہ صرف بھارت ہی نہیں اور بھی کئی دشمن تاک میں ہیں۔ اگر یہ مذاکرات آخری مرحلہ پر ناکام ہو گئے تو اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ کسی کی انا کا مسئلہ مذاکرات کی کامیابی میں حائل ہو جائے۔ راقم کو مذاکرات کی ناکامی میں یہ فکر دامن گیر ہے کہ ایسی صورت میں مشرف کا کلی انحصار امریکہ پر ہو جائے گا اور امریکہ کے بہت سے مفادات اس وقت پاکستان سے منسلک ہیں۔

افغانستان میں طالبان اپنی طاقت کو ایک بار پھر مجتمع کر رہے ہیں۔ زابل میں جس طرح انہوں نے افغانستان کی سرکاری فوجوں اور اتحادی فوجوں کا مقابلہ کیا ہے وہ یقیناً جرأت اور بہادری کی انتہائی عمدہ مثال ہے۔ امریکیوں نے اگرچہ یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد علاقہ سے طالبان کا خاتمہ کر دیا ہے۔ یہ دعویٰ درست معلوم نہیں ہوتا۔ طالبان کے لئے چونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ایک جگہ جم کر لڑیں ویسے بھی یہ گوریلا جنگ کے اصولوں کے خلاف ہے لہٰذا طالبان نے ایک وقت تک زابل کے پہاڑوں میں جنگ کی ہے اور جب انہوں نے مناسب سمجھا وہ وہاں سے منتشر ہو گئے ہیں اب وہ یقیناً افغانستان کے کسی اور حصہ سے نمودار ہوں گے اور امریکہ کے لئے مسئلہ پیدا کریں گے۔ امریکہ فی الحال افغانستان کے بارے میں پاکستان کی پالیسی سے مطمئن نہیں ہے وہ پاکستان پر شدید دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ افغانستان میں طالبان کی سرکوبی کے لئے اس سے مکمل تعاون کرے جو وہ سمجھتا ہے کہ اسے پاکستان سے نہیں مل رہا مجلس عمل اور مشرف کھلم کھلا اگر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے تو راقم کی رائے میں امریکہ مشرف سے مطلوبہ تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

امریکہ کو پاکستان کا تعاون عراق میں بھی درکار ہے وہ پاکستان کی فوجی صلاحیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ عراق میں امریکہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ عراق میں امریکی افواج کے سربراہ نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس وقت عراق میں امریکی افواج پر روزانہ پندرہ حملے ہو رہے ہیں۔ وہ سلامتی کونسل میں پے در پے قراردادیں لا رہا ہے تاکہ اس کی مصیبت اقوام متحدہ کے گلے پڑ جائے لیکن وہاں فرانس اور جرمنی امریکہ کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں اور امریکہ سے ناک کی لکیریں نکلوا رہے ہیں۔ انسانی جانوں کے نقصان کے علاوہ امریکہ عراق میں جاری جنگ میں چار ارب ڈالر ماہانہ خرچ کر رہا ہے۔ اس جانی اور مالی نقصان پر اندرون ملک بش پر شدید تنقید ہو رہی ہے اگر پاکستان' بھارت اور ترکی عراق میں افواج بھیجنے پر رضامند ہو جاتے ہیں تو امریکہ کا مسئلہ کافی حد تک حل ہو جائے گا۔ جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہ امریکہ سے پہلے ہی بھاری مفادات حاصل کر رہا ہے امریکہ اسے اپنا سٹریٹیجک پارٹنر قرار دے چکا ہے پھر یہ کہ اسے عراقی مسلمانوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ وہ تو قیمت بڑھانے

⇦

''ہماری رُوح برائے فروخت نہیں ہے''

مئی' جون 1950ء میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان صاحب نے امریکا کا دورہ کیا تھا اور وہاں صنعت وتجارت کے لیڈروں سے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔ ایک میٹنگ میں امریکی لیڈروں نے پاکستان کو ہر ممکن فوجی اور اقتصادی امداد کا یقین دلایا تھا' بشرطیکہ پاکستان اسرائیل کو تسلیم کرلے۔ امریکی صنعت کاروں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے سے پاکستان کو کیسے کیسے فوائد کا پیکج مل سکتا ہے' اس پیشکش کے جواب میں لیاقت علی خان صاحب نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا تھا: ''حضرات! ہماری رُوح برائے فروخت نہیں ہے۔''

کے لئے انکار کر رہا ہے۔ جہاں تک ترکی کا تعلق ہے عراق کے ساتھ اس کی سرحد ملتی ہے وہ اپنے علاقائی مفادات کو مدِنظر رکھے گا۔ وہاں پر بھی اقتدار کا سرچشمہ فوج ہے جس نے ملک میں سیکولر نظام کو قائم رکھنے کا حلف اٹھایا ہوا ہے۔ اسلام اور دین کے رشتہ سے وہ بالکل ناآشنا ہیں۔ اگر امریکہ نے اسے کوئی پرکشش آفر کی تو وہ امریکہ کی ضرورت کو کیش کرائیں گے۔

عراق فوجیں بھیجنے کے حوالہ سے امریکہ کے نزدیک ترکی اور بھارت سے پاکستان زیادہ اہم ہے۔ پاکستان اگر عراق میں اپنی افواج کو بھیجتا ہے تو عرب ممالک کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے' وہاں مایوسی پھیلے گی اور مسلم ممالک میں مزید دوری بلکہ دشمنی پیدا ہوگی۔ پھر یہ کہ پاکستانی افواج کی غیرممالک میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں کارکردگی بہت بہتر رہی ہے۔ وہ حکم ملنے پر جان پر کھیلنا جانتے ہیں۔ لہٰذا اگر مشرف کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بدلہ میں امریکہ کو عراق میں پاکستان کا تعاون حاصل ہوتا ہے تو یہ انتہائی سستا سودا ہے۔ اگرچہ اس وقت عراق میں امریکہ کے خلاف مزاحمت کا بہت شور ہے لیکن قارئین کے لئے یہ خبر یقیناً حیران کن ہوگی کہ عراق میں زیادہ گڑبڑ صرف ۸۰ کلومیٹر میں ہے جبکہ افغانستان کا بہت وسیع علاقہ ایسا ہے جو طالبان کی کارروائیوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ امریکہ عراق کی نسبت افغانستان میں کہیں زیادہ بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ لیکن یہاں اسے یہ امید ہے کہ جب کبھی پاکستان کا مطلوبہ تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا وہ حالات پر قابو پالے گا اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو وہ کسی بہانے یہاں سے نکل جائے گا۔ جبکہ عراق سے نکلنے کا مطلب یہ ہوگا کہ گریٹر اسرائیل کا قیام ممکن نہیں اور امریکہ کی وہاں سے پسپائی عربوں کو زبردست حوصلہ دے گی اس لئے عراق کا شور زیادہ مچایا جارہا ہے۔ عراق پر امریکی قبضہ اسے لے پالک اسرائیل کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ راقم یہ خطرہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اگر عراق پر امریکہ کے حالات مزید خراب ہوئے تو وہ اسرائیل سے شام پر حملہ کروادے اس سے عراق میں دراندازی کے راستے بھی بند ہوجائیں گے اور عرب بھی مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب جائیں گے لہٰذا پاکستان کو کسی قیمت پر افغانستان اور عراق میں امریکہ کی مدد کو نہیں پہنچنا چاہئے صرف اس بات کو مدنظر رکھ کر اگر مجلس عمل مشرف سے اس حد تک تعاون پر تیار ہوجائے کہ وہ اس کے اقتدار کے لئے خطرہ نہیں بنیں گے۔ تو راقم کے نزدیک اس میں حرج نہیں فتنہ سے بچنے کے لئے مجلس عمل کو اس ناگزیر برائی کا ارتکاب کرلینا چاہئے۔ وگرنہ مجلس عمل اور مشرف کے درمیان اگر محاذ آرائی جاری رہی تو شاید آج لوگ اس کے تباہ کن اثرات کا اندازہ نہ کرسکیں۔ ✿

تنظیم اسلامی کا پیغام
نظام خلافت کا قیام

forced the Allies to halt the attack and eventually to give up virtually all the territory they had captured. Eisenhower's actions make clear that he understood that American interests lay in a stable Middle East and an Israel confined to its 1949 borders. Immensely popular as he was, Eisenhower was largely able to shake off the pressures placed by the Jewish lobby on Congress and the Executive. His relative independence was virtually the last such example in American history.

In the 1978 "Litani Operation," Israel established firm control over the Wazzani River, which flows into the Jordan, as well as almost the entire length of the Hasbani River. And in the 1982 "Operation Peace for Galilee," the entire length of the Litani River came under Israeli control.

To the first governments in Israel, Lebanon seemed an obvious early target in part for its important water resources and in part because it seemed politically weaker than the other neighboring Arab countries. But Israeli plans for Lebanon had to be postponed until after 1967. Israel was dependent on France for arms supplies and could not have acted openly against France's wishes. The end of France's colonial war against Algeria and De Gaulle's growing impatience with Israel's arrogance led to the termination of the French-Israeli special relationship in 1967, and to its substitution by the exclusive U.S.-Israel one.

The Lebanese Civil War (1975-1990) cost about 100,000 lives and destroyed a vital secular government and civil society that is still reeling from the onslaught. Christians were pitted against Lebanese Moslems, and the situation was further complicated by the presence of 350,000 Palestinians and the PLO. Israel's contribution to the war was massive. Israeli attacks on Lebanon began as early as 1968 and continued through 1982 and after. "Before the Lebanese army disintegrated in 1976, it had given a figure of 1.4 Israeli violations of Lebanese territory per day from 1968-74." According to author Rosemary Sayigh, such "attacks continued to escalate and were a major factor in bringing about the Civil War of 1975/6."

The twin ascendancy of the right-wing regimes of Israeli Prime Minister Menachem Begin and President Ronald Reagan led to the brutal 1982 Israeli invasion of Lebanon that claimed an estimated 17,000 to 19,000 Lebanese and Palestinian lives, the great majority of whom were civilians. The pretext for the invasion was the threat to Israeli security by PLO cross-border raids and shelling. But even at the time, observers were quick to point out that the border had been quiet for eleven months due to a cease-fire negotiated by Reagan emissary Philip Habib. Indeed the months of quiet made the Israelis desperate for a pretext to begin the war. If Israeli security was not the reason for the Israeli invasion, how are we to explain it? Once again the documentary evidence reveals that the Israeli campaign against Lebanon was undertaken for political and not security purposes.

Israel's two-week bombing campaign against Lebanon in July 1981, a prelude to the 1982 war, is an extreme case of Israeli terrorism. The episode is also an instructive example of the divergence between U.S. and Israeli policy goals in Lebanon. The U.S. was interested in a stable Lebanon in order to pacify its Arab allies, and to beat back the Soviet challenge in the region. In direct opposition to American policy objectives, Prime Minister Begin and Defense Minister Sharon were determined to destabilize Lebanon and create a puppet, Christian-led government.

The highly sensitive issue of dual loyalty arises when U.S. and Israeli Middle East policy objectives diverge and when elements in the U.S. prefer Israeli interests over and above U.S. interests. Indeed, in such cases, the term dual loyalty is something of a misnomer in that it tends to suggest a balanced approach while Israel's partisans in the U.S. invariably prefer Israel's interest over and above America's.

The resignation of Alexander Haig in 1982 is evidence that the Reagan administration's irresponsibility in raising no effective objections to Israeli excesses in Lebanon had limits. The U.S. government at that time was sufficiently flexible and rational to pull back when it was necessary and was able to focus on the simple idea that a peaceful Middle East was in American interests. Today, a similar awareness is evidently lacking. The disappearance of the Soviet Union as a counterweight to U.S. interests in the Middle East has allowed the current U.S. regime a free hand to ally itself completely with the Sharon government's repressive and brutal policies.

Prime Minister Sharon has used his political skills to unite the Israeli public behind dramatic restrictions on the ability of the Palestinians to pursue civil life. Despite the current incarnation of the "peace process," inaptly named the "road map," never have the Palestinians been so threatened by Israeli policies. Through a combination of intimidation and effective use of the Israeli lobby in the U.S. and the complete subservience of Congress, Ariel Sharon, for example, has not been called to account for the March 2003 bulldozer murder of Rachel Corrie, a U.S. citizen, who was one of three international peace activists killed or seriously wounded by the Israeli army within a month's time.

Palestinians cannot get to schools, businesses, or pursue normal economic life. They must face checkpoints without end, "targeted assassinations," tanks, sharpshooters, F-16s and Apache helicopters in their population centers. A "security wall" currently being erected in the West Bank is gobbling up thousands of acres of Palestinian olive groves, farms, factories, and is affecting hundreds of thousands of Palestinians in a hundred villages or communities located in between the wall and Israel's 1967 borders or nearby. All this while the world focuses on the "Road Map" which many observers view as little more than a distraction and a public relations ploy.

It seems clear that the Israeli government will continue to do everything it can to prevent the replacement of Palestinian infrastructure destroyed by the IDF in the West Bank during their Spring 2002 campaign. Without reconstruction, without a viable economy, what can the future possibly hold for the Palestinians? An indication of what the Israelis have in store for the Palestinians, is the uninhibited talk of "transfer" even by a member of Sharon's cabinet." As prime minister, Sharon knows better than to espouse such views. However, in 1988, as trade minister and member of the inner cabinet during the first intifada, he warned that the Palestinian uprising "would lead inevitably to war with the Arab states and the necessary expulsion of the Arabs from the West Bank, Gaza and the Galilee."

Many observers feared that the war on Iraq might have provided a sufficient screen for the mass expulsion of many of the more than 3.5 million Palestinians living in the occupied territories. But Israel was not attacked and the American advance on Baghdad was so rapid that no opportunity was provided for mass expulsions. Nevertheless, time is on the side of the Israelis and they are masters of creating and making use of opportunities. After they were forced by President Eisenhower to return the Sinai and Gaza in 1956, they waited until the political scene was primed in 1967. Once again time is on their side as the "war on terror" continues and U.S. policy makers continually make threats against Iran and Syria, both high on Israel's enemies list.

Prospects for peace seem slim and growing slimmer. One indicator of the difficulties that lie ahead is National Security Adviser Condoleeza Rice's comment in Tel Aviv in mid-May 2003. Ms. Rice said that the "security of Israel is the key to the security of the world." As one close observer of right wing influence on U.S. policy put it, this goes far beyond even the "neocon claim that the security interests of the U.S. and Israel are identical."

Curtsy: www.ameu.org

Vol : 12 Regd.No.LRL-50 No.33
Weekly Nida-e-Khilafat Lahore

Excerpts From

In the Beginning, There Was Terror

By: **Ronald Bleier**

Much of the history of terrorism in today's Middle East has been thrust down the Orwellian memory hole due to the highly effective campaign over the past 50 years to suppress information prejudicial to Israel.

Blowing up a bus, a train, a ship, a café, or a hotel; assassinating a diplomat or a peace negotiator; killing hostages, sending letter bombs; massacring defenseless villagers — this is terrorism, as we know it. In the modern Middle East it began with the Zionists who founded the Jewish state. 1

Israel's original sin is Zionism, the ideology that a Jewish state should replace the former Palestine. At the root of the problem is Zionism's exclusivist structure whereby only Jews are treated as first-class citizens. In order to create and consolidate a Jewish state in 1948, Zionists expelled 750,000 Palestinians from their homeland and never allowed them or their descendants to return. In addition, Israeli forces destroyed over 400 Palestinian villages and perpetrated about three dozen massacres. In 1967, the Israelis forced another 350,000 Palestinians to flee the West Bank and Gaza as well as 147,000 Syrians from the Golan Heights. Since 1967 Israel has placed the entire Palestinian population of the Territories under military occupation.

One of the most notorious acts of Israeli terrorism occurred during the 1948 war when Jewish forces, members of the LEHI underground (also known as the Stern Gang) assassinated Swedish Count Folke Bernadotte, a U.N. appointed mediator. At the least, his murder was a warning to any who might have tried to follow his activist example.

One of the most notorious examples of Jewish/Zionist terrorism in the post-war period 1945-1948, was the bombing of the King David Hotel on July 22, 1946. The King David Hotel was brought down by means of 50 kilos of explosives, placed beside supporting pillars in the hotel's "La Regence" restaurant. Timers were placed for 30 minutes. After the bombers made their escape, telephone messages were placed to the hotel telephone operator and to the Palestine Post. The French Consulate, adjacent to the hotel was also warned to open its windows to prevent blast damage, which it did. Some 25 minutes later, a terrific explosion destroyed the entire southern wing of the hotel— all seven stories. The official death toll was 91 dead: 28 Britons, 41 Arabs, 17 Jews, and five others.

On the night of October 12, 1953, a grenade was thrown into a Jewish settlement east of Tel Aviv, killing a woman and two children. Ben Gurion and others planned a powerful retaliatory blow against a Jordanian village from which it was determined the attack originated. Two nights later, Ariel Sharon's Unit 101 killed 60 people in the Jordanian border village of Kibya.

One of the most historically significant "false flag" schemes is the infamous Lavon Affair which is one of the few such operations that the Israeli government was forced to acknowledge. In July 1954, about 10 Egyptian Jews under the command of Israeli agents planted bombs in British and American properties and Egyptian public buildings in Cairo and Alexandria. The spy ring was caught and broken up on July 27, when one of its members was caught after a bomb exploded in his pocket in Alexandria.

There was a trial and two of the accused were condemned to death and executed, while the three Israeli commanders escaped and a fourth committed suicide. A scandal subsequently ensued in Israel that turned on exactly who ordered the operation. Chief of Staff Moshe Dayan, Director General of the Ministry of Defense Shimon Peres, and Intelligence Chief Colonel Benjamin Givli were the culprits.

At the time of the bombings negotiations were at their height between Cairo and London for the evacuation of the Canal Zone, and between Cairo and Washington for arms supplies and other aid in connection with a possible U.S.-Egyptian alliance. Stephen Green presents an even more cynical picture of top Israeli officials who initiated the terrorist operation in order to sabotage Prime Minister Sharett's ongoing and quietly successful negotiations with Egyptian President Gamal Nasser.

On November 23, 2001, the Israelis assassinated Mahmud Abu Hunud, a top Hamas operative. Two days later, Israeli journalist Alex Fishman, in a front-page article, explained that before the assassination of Hunud there had existed a "secret" and unacknowledged gentlemen's agreement between Hamas and the Palestinian Authority that "Hamas was to avoid in the near future" suicide bombings in Israel. As Fishman wrote: "Whoever decided upon the liquidation of Abu Hunud knew in advance" that the agreement with Hamas would be "shattered.... The subject was extensively discussed both by Israel's military echelon and its political one..."

Just as Fishman had predicted, Hamas soon struck back and less than a week later, on December 1 and 2, suicide bombings in Jerusalem and Haifa killed 25 Israelis. The effect of this cycle of violence was predictably to heighten tensions and to dramatically weaken the constituency in Israel and the U.S. for peace negotiations.

In the October 1956 surprise attack by Israel, France and Britain against Egypt., the Allies conquered the Suez Canal, Eastern Sinai and the Gaza Strip. The combined invasion occurred at a time when the U.S. sought to stabilize the area. But the Israeli interest was precisely the opposite. It was to exacerbate tensions and make it difficult or impossible for Egypt to gain the weapons it needed to deter Israel from war.

An important incident leading up to the October 1956 war was a massive raid on an Egyptian Army Camp in Gaza, "the bloodiest incident between Egypt and Israel since the 1948 war." The raid took place about a year and a half earlier in a period "of relative tranquility following the enforcement of repressive measures decided on by the Egyptian administration of the Strip." On the night of February 28, 1955, the Israelis sent in 50 paratroopers who wound up killing 39 Egyptians and wounding 30 others. Sharett approved the operation, but was "shocked" by the loss of life, as he wrote on March 1, 1955:

In the end, an enraged President Eisenhower, who was not informed of tripartite plans to make war on Egypt,